راہگزر تکتے رہے

سیماؔب

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

راہگزر تکتے رہے

سیماںؔ

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

طابع : شیخ نیاز احمد

مطبع : علمی پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت : Rs 15.00

مقام اشاعت
شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

سینی ٹوریم کے اس مریض کے درد کی نذر ـــــ جس کا نام خالد تھا. وہ ـــــ جو
اجنبی تھا مگر ـــــ جس کی جاتی ہوئی زندگی کا تصوّر دل پر نقش ہے ـــــ

اپنی پیاری دوستوں، ساجدہ کمال، شاہینہ ، زیبا خلیل اور سائرہ حمید
کی نئی زندگی کے نام ــــــــــــــــــــــــ

سیماں

سہاگ، تیرے نام اے مشرقی عورت ــــ سہاگ، جو تیری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے ــــ جس کی خوشبو میں ڈوب کے تو اپنوں سے ٹوٹ جاتی ہے۔ ماضی سے اُتر کے ایک حسین مستقبل کی بنیاد رکھتی ہے ــ سہاگ، ہی وہ ستون ہے جس پر تیری عصمت کا محل قائم ہوتا ہے ــــ اور اے مشرق کی بیٹی عصمت کی حفاظت تیرا اوّلین فرض ہے ــــ مگر اس محل کو قائم کرنے کے لیے تجھے میکے کی دہلیز عبور کرنا ہوگی ــــ لیکن خبردار، اپنے ماضی کی حسین یادوں کو اپنے دامن سے یہیں جھٹک دے ــــ قہقہے، آنسو، مسکراہٹیں، آہیں اور سسکیاں تجھے اسی دہلیز کے پیچھے دفن کرنا ہیں۔ وہ ــــ جو سامنے ایک حسین مستقبل تجھے آواز دے کر بُلا رہا ہے۔

ہوشیار، تیرے ماضی کی ایک ہلکی سی جھلک بھی اس پر آشکار نہ ہو؛ ورنہ مشرق کی اے معصوم بیٹی، تیرا سہاگ، تجھ سے روٹھ جائے گا۔ تو تنہا رہ جائے گی۔ تیری عصمت کا محل کرچی کرچی ہو کے دنیا کے قدموں میں بکھر جائے گا اور پھر بے درد زمانے والے تجھ سے جینے کا حق بھی چھین لیں گے تو مر مر کے جیے گی ــــ اور جی جی کے مرے گی ــــ تیری کوئی زندگی نہیں ہوگی ــــ

تیری کوئی موت نہیں ہوگی۔

پھر یوں بھی ہو سکتا ہے تو اپنے سہاگ کی خوشبو میں مست ہو اور تیرا محبوب تیرے غم میں سسک رہا ہو ــــ یا پھر تیری جدائی کا کرب اُس کے اندر کسی فن کار کو جگا گیا ہو، تیری یاد میں ڈوب کے وہ اپنے درد کو اشعار میں ڈھال رہا ہو یا صفحۂ قرطاس پر افسانوں کی صورت میں بکھیر رہا ہو ــــ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے خونِ جگر میں برش ڈبو کے تیرے نقش ابھارتا ہو ــــ لیکن ــــ خبردار، اے بے خبر تجھے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھنا ــــ قربانی، اے مشرق کی بیٹی پیار قربانی چاہتا ہے ــــ عزت قربانی چاہتی ہے۔ سہاگ قربانی چاہتا ہے ــــ یاد رکھ اپنے ارمانوں کے خون سے تجھے اپنے سہاگ، کو سینچنا ہے ــــ تیرے سہاگ کی زندگی تیری عزت کی حیات ہے ــــ

اِدھر فن کار کا درد اُس کے لیے زندگی ہے ــــ اور درد کا احساس فن کی عظمت ــــ دل خون ہو کے ہی فن کو جلا بخشتا ہے ــــ وہ دیکھو یہاں بھی کوئی ہارا ہوا دل ــــ درد کا مارا ایک فن کار کسی شاہکار کو جنم دے رہا ہے ــــ کیا یہ حرماں نصیب بھی کسی کا سہاگ قائم کر سکا؟

ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا ــــ

سیماں

(۱)

کون آنچل میں سمیٹے گا میرے ریزوں کو
میں یہی سوچ کے دھرتی پہ بکھر بھی نہ سکا

وہ کینوس پر جھکا ہوا ہے —— سپید محراب دار پیشانی پر سیاہ خشک بالوں کا جھکاؤ ہے اور گہری سیاہ آنکھوں میں ایک اُداس سوچ —— اُس کے شفاف چہرے سے فہم وادراک کی لکیریں ہویدا ہیں —— دائیں ہاتھ میں برُش اور بائیں ہاتھ میں ایک آبنوسی پیالہ ہے جس میں گہرا سیاہ رنگ بھرا ہوا ہے —— کینوس پر جھکا ہوا مصوّر کسی شاہکار کو جنم دے رہا ہے —— منظر کسی قدر افسردگی کا تاثر لیے ہوئے ہے اور اُس کے دلفریب نقوش میں جو ایک اُداسی گھُلی ہوئی ہے شاید وہ اُس کے دِلی کرب کا احساس ہے یا پھر افسردہ منظر کا عکس پڑ رہا ہے اس کے چہرے پر —— تصویر میں کسی برفانی علاقے کا ایک حصّہ پیش کیا گیا ہے چہار جانب سپید سپید برف ہی دکھائی دیتی ہے —— ابتدا میں ایک تناور درخت ہے جو برف سے تقریباً ڈھکا ہوا ہے اُس کی ٹہنیوں اور پتوں پر سپید برف چمٹی ہوئی ہے —— اور اسی درخت کے تنے سے ٹیک لگائے ایک سوگوار دوشیزہ جس کے سیاہ بال اس کے شانوں پہ پریشان ہیں دُور کسی محسوس نہ ہونے والے نکتے کو تک رہی ہے —— اور سپید برفیلی راہ پر کسی کے قدموں کے نشان دُور بہت دُور چلے گئے ہیں —— مصوّر کا

شاہکار تقریباً مکمل ہے اور یہ شاید اُس کی آخری ٹچنگ ہے اُس کے دائیں ہاتھ میں بُرش ہے اور بائیں ہاتھ میں ایک آبنوسی پیالہ جس میں سیاہ رنگ بھرا ہوا ہے اور وہ دوشیزہ کے بالوں کو سیاہی بخش رہا ہے —— یہ ایبٹ آباد کے پہاڑی علاقے پر بنے ہوئے مکان کا" ایک کمرہ ہے —— برفانی ہوائیں خاصا شور مچا رہی ہیں —— لیکن وہ اس لمحے دوسرے ہر احساس سے بے نیاز ہے —— اُس کے جسم پر لون کا ایک باریک کرتا ہے جو ہوا سے پھڑ پھڑا کے اس کے جسم سے چپک جاتا ہے لیکن شاید مصوّر اپنے فن میں ڈوب کے ابھرنا نہیں چاہتا —— جب تک کہ فن کی تکمیل نہ ہو جائے۔ اُس نے ایک بار پھر پیالے میں برش ڈبویا —— اور نگاہوں کو دوشیزہ کے چہرے پہ ٹکا کے آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھایا —— مگر اس سے پہلے کہ بُرش کینوس کو چھُو سکتا —— بند کھڑکی کے پٹ ایک زور دار آواز کے ساتھ کھُل گئے —— برفانی ہوا کا ایک سخت تھپیڑا مصوّر کے بازو سے پتھر کی مانند ٹکرایا —— اس کے ہاتھ سے پیالہ چھوٹ گیا —— رنگ بکھر گیا۔ مصوّر کی نگاہوں میں جیسے سیاہی بھر گئی دل میں ایک درد سا محسوس ہوا۔

بایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں اور —— کھولیں تو شاہکار کا حسن مجروح ہو چکا تھا اُس کے سیاہ مقدر کی طرح —— اس کا شاہکار بھی سیاہی میں ڈوب چکا تھا، مگر کسی کے قدموں کے سپید نشانات اب بھی اس گھور سیاہی سے جھانک رہے تھے وہ خالی خالی آنکھوں

سے کینوس پر دیکھتا رہ گیا —— وہاں ایک بڑے سیاہ دھبے پر جہاں کچھ دیر پہلے ایک حسین چہرہ تھا۔ مصوّر کی نگاہوں کی ویرانی گہری ہوتی گئی لیکن پھر یکایک اُن آنکھوں میں ایک دھیمی دھیمی عجیب سی روشنی سلگ اُٹھی اُسے یوں محسوس ہوا —— اس سیاہی کی اوٹ سے کوئی روشن چہرہ جھانک رہا ہو۔

"شہناؔ" اُس کے لب پھڑپھڑائے —— "تم کہاں ہو؟ —— تم کہاں ہو شہنیؔ" اُس کی آواز ڈوبتی چلی گئی —— دُور کہیں شہنائی کی آواز اُبھر رہی تھی۔ کوئی پرایا ہو رہا تھا۔ کوئی اپنا رہا تھا کسی کو —— وہ پلٹا —— اور آہستہ قدموں کے ساتھ کھُلی ہوئی کھڑکی میں آ کھڑا ہوا، کوئی بارات جا رہی تھی —— دُور کتنی ہی ننھّی ننھّی کاریں پھولوں سے لدی ہوئی دھیمے دھیمے سرک رہی تھیں —— دور —— بہت دور —— مگر اپنے چہرے سے ٹکرانے والی سرد ہوا میں وہ ان پھولوں کی مہک محسوس کر سکتا تھا —— ہوا کے دوش پر شہنائی کی آواز کبھی بہت قریب آ جاتی اور کبھی بہت دُور —— چلی جاتی۔ پھولوں سے لدی ہوئی کاریں بدستور آہستہ آہستہ سرک رہی تھیں شاید اس لیے کہ وہ نازک پیکر جسے "دولہن" کہا جاتا ہے —— کہیں ٹوٹ کے بکھر نہ جائے ——

"دولہن"۔ اُس نے آنکھیں موند لیں —— "میری دولہن —— شہنیؔ تم کہاں ہو؟" اس کی آنکھیں بھر آئیں —— اور وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھُپا کے ہولے ہولے سسکیاں بھرنے لگا۔

پھولوں سے لدی ہوئی سفید خوبصورت کار ایک اونچی پہاڑی سے گزر رہی تھی ___ پچھلی سیٹ پر گہرے سرخ لباس میں سمٹی ہوئی دولہن نے کسمسا کے پہلو بدلا ___ گاڑی کا سکوت اس کے بھاری زیورات کی کھنک سے ٹوٹ گیا۔ اس کے قریب بیٹھے ہوئے وجیہہ نوجوان نے اُس کی طرف دیکھا اور اپنا مضبوط ہاتھ جس کی انگلیوں میں کئی بیش قیمت انگوٹھیاں پڑی ہوئی تھیں، دولہن کی طرف بڑھایا اور اُسے خود سے قریب کرلیا ___ شاید اس قُرب سے گھبرا کے ___ دولہن نے اپنا حسین چہرہ کھڑکی کی طرف پھیر لیا تھا ___ اُسی لمحے سرد ہوا کا ایک جھونکا اس کے چہرے کو چھوتا ہوا ___ گاڑی میں در آیا وہ ہولے سے کپکپا گئی ___ مدھم مدھم سسکیوں کی آواز ___ یہ جھونکا کسی کا پیغام لایا تھا ___ دولہن کو اپنے چہرے پر نمی کا احساس ہوا ___

"شاید آس پاس کہیں برف باری ہو رہی ہے" دولہا نے اپنی گھمبیر آواز میں کہا ___

اور برف باری ہوتی رہی ___

۲

وقت معصوم سا ضدّی بچّہ
لوگ خوش رنگ غباروں جیسے

برف کا ایک ٹکڑا ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ اس کے سینے سے ٹکرایا اور کُرتے پر اٹک گیا —— سینے میں ایک آگ سی دھک رہی تھی مگر ٹھنڈک کا یہ احساس ایک طمانیت سی بخش گیا —— ایک لمحے کی دیر تھی کہ برف کا ٹکڑا پگھل کے اس کے کُرتے میں جذب ہوگیا —— شاید دل سے اُٹھنے والی تپش سے متاثر ہو کر دل میں اتر گیا تھا اور اُتر کر ایک درد بن گیا تھا اس نے دونوں ہاتھوں سے سینے کو بھینچ کے شہناؔ کو یاد کیا —— تب ہی اُس نے محسوس کیا، شہنائی کی آواز معدوم ہو رہی تھی —— نم آنکھوں کے گوشے سکیڑ کے اس نے سامنے دیکھنے کی کوشش کی —— مگر پہاڑی راہ پر اس آواز کے سوا کچھ بھی نہ تھا —— بارات جا چکی تھی، شہنائی کی آواز اب بھی اُبھر رہی تھی —— سسک رہی تھی —— دم توڑ رہی تھی۔ وہ سینے کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے پلٹا —— اور پلنگ پر اوندھے منہ گر پڑا —— شہناؔ کی یاد بڑی شدت سے ابھری تھی اور اس یاد کے سائے سائے وہ دُور نکل آیا —— اپنے ماضی کی وادیوں میں اپنے پیارے دیس روشنیوں کے شہر کراچی میں —— وہ مارچ کی ایک چمکیلی شام تھی —— خالدؔ وصی

اُس وقت صدر کے مشہور علاقے میں گھوم رہا تھا ــــ چند دن بعد اُس کی چھوٹی بہن کی سالگرہ تھی ـــــ اور اپنی بہن کو تحفہ پیش کرنے کے لیے وہ یہاں کوئی خوبصورت ساری خریدنے آیا تھا ـــــ پھر اس کی نگاہ ایک مشہور ساری ہاؤس پر پڑی ۔ سائن بورڈ پر ثناء اللہ فیبرکس کے خوب صورت الفاظ روشن تھے ـــــ وہ آگے بڑھ کر سیڑھیاں طے کرنے لگا ۔ نرم قالین پر آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا وہ مختلف شوکیسوں میں لگی ہوئی ساریوں پر تنقیدی نگاہیں ڈالتا رہا ـــــ اور پھر ایک سبز رنگ کی ساری جس پر خوبصورت سنہری کام تھا اُسے پسند آگئی ـــــ ساری اور اس کا ہم رنگ بلاؤز کا پیس پیک کرواکے اس نے بل ادا کیا ـــــ کیش میمو لے کے جیب میں ڈالا اور پیکٹ اٹھا کے باہر نکل آیا ـــــ تب ہی اُسے اپنی گاڑی کی خرابی کا شدت سے احساس ہوا کیونکہ کراچی جیسے شہر میں ٹیکسی یا رکشہ پکڑ لینا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا ـــــ یہی سوچتا ہوا وہ خاصی دور نکل آیا ۔ پھر اٹھتی ہوئی نگاہ نے سامنے سے ایک خالی ٹیکسی آتی دیکھی ۔ اس نے ہاتھ دیا مگر کر یہہ صورت ڈرائیور شہنشاہ کی طرح اُس کی جانب دیکھے بغیر تیزی سے ٹیکسی آگے بڑھا لے گیا ـــــ اسی طرح کئی رکشہ اور ٹیکسیوں کو اُس نے ہاتھ دیے ۔ لیکن وہ سب اس کے چہرے پر دھواں چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ گئیں ۔ اس نے اُکتا کر رُخ تبدیل کیا اور تب اس نے دیکھا اس سے تھوڑے فاصلے پر آسمانی رنگ کے شلوار قمیص میں ایک لڑکی کھڑی تھی ۔ خالی رکشہ گزرا ـــــ

اور اُس کے ساتھ ہی لڑکی کا ہاتھ بھی اٹھا ——— مگر گزشتہ ٹیکسیوں کی طرح وہ بھی بغیر رُکے آگے بڑھ گئی ——— دونوں نے ایک گہرا سانس بھر کے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی نگاہ لڑکی کے چہرے پر اٹکی رہ گئی ——— بے حد معصوم چہرہ تھا گندم کی طرح شفاف رنگت، سیاہ تراشیدہ بھنووں کے نیچے دو روئی روئی سی آنکھیں ——— خوبصورت سا ناک جس میں ایک ننھا سا فیروزہ چمک رہا تھا ——— گلابی لب جو سانس کھینچتے ہوئے تھوڑا سا کھل گئے تھے ——— اور پھر یک لخت وہ روئی روئی سی آنکھیں گھنیری پلکوں کی اوٹ میں چھپ گئیں ——— لڑکی نے منہ پھیر لیا تھا ——— وہ بھی دوسری طرف دیکھنے لگا۔ سامنے سے بس آتی نظر آئی ——— اسی کے روٹ کی تھی۔ قریب آکر رُکی ——— اور وہ پیکیٹ سنبھال کر جلدی سے بس میں سوار ہو گیا ——— مبادا اُس سے بھی رہ جائے ——— سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ وہ لڑکی بھی اپنا سیاہ پرس سنبھالتی ہوئی بس کے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ اِدھر اُدھر دیکھا کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔ تب وہ اٹھ گیا۔

"آپ بیٹھ جائیں۔" اُس نے ہولے سے کہا۔

"شکریہ۔" وہ زیرِ لب منمنائی ——— اور سیٹ پر بیٹھ گئی ——— بس چل پڑی ——— خالد نے دائیں ہاتھ سے بس کا سٹینڈ تھاما ہوا تھا ——— اور بائیں ہاتھ میں ساڑی کا پیکیٹ ——— بار بار بس ہچکولے کھا رہی تھی ——— اور لڑکی اس کے اپنی طرف جھک آنے پر دوسری

طرف سمٹ جاتی تھی۔ پھر ایک بس سٹاپ پر بس رُکی اور ڈرائیور نے اس بری طرح بریک دیے کہ وہ گرتے گرتے بچا۔ خود تو سنبھل گیا لیکن پیکٹ ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر گیا — اس وقت لڑکی جو کچھ سوچ رہی تھی — اپنے خیال سے چونکی، نیچے دیکھا اور جھک کر پیکٹ اٹھا لیا —

"شکریہ محترمہ"۔ اس نے کہا اور پیکٹ لینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

"جی"۔ لڑکی نے تعجب سے اُسے دیکھا۔

"جی — میرا پیکٹ"۔ اس کے چہرے کو دیکھ کے وہ آہستہ سے بولا۔

لڑکی کے چہرے پر غصے کے تاثرات نمودار ہوتے — ایک لمحہ اسے گھورتی رہی، پھر ایک جھٹکے سے رُخ دوسری طرف پھیر لیا — خالد کچھ پریشان سا ہو گیا —

"دیکھیے محترمہ، مذاق نہ کریں — میرا پیکٹ......"

"مذاق آپ کر رہے ہیں — یا ہم — بدتمیز"۔ لڑکی نے لب بھینچ کر کہا۔

"مسئلہ کیا ہے؟" ایک شخص نے ان کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا۔

"جناب یہ پیکٹ میرا ہے"۔ خالد سنجیدگی سے بولا۔ "نہ جانے کیوں یہ محترمہ......"

"جی نہیں، یہ پیکٹ ہمارا ہے۔ یہ مسٹر خواہ مخواہ ہم سے اُلجھ

رہے ہیں"۔ لڑکی نے جلدی سے کہا۔

اِدھر اُدھر کے لوگ بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے ـــــ وہ دونوں ہی مہذّب اور شریف صورت نظر آ رہے تھے آخر کس کا یقین کیا جاتا ـــــ اور پھر عام طور سے پبلک لڑکی کے ساتھ ہوتی ہے ـــــ وہ خاصا پریشان ہو گیا تھا کہ آخر کرے تو کیا کرے ـــــ مگر اسی وقت کنڈیکٹر نے آکر اس کی یہ مشکل حل کر دی ـــــ اُس نے کہا۔

"جناب، یہ پیکٹ مجھے دے دیا جائے اور آپ دونوں حضرات پیکٹ کے اندر موجود اشیاء کی فہرست مجھے بتا دیں"۔

تب خالد کے لبوں پر مسکراہٹ اتر آئی۔ اس نے بڑے اطمینان سے کہا:

"ٹھیک ہے، پہلے آپ ان محترمہ سے پوچھ لیں"۔

اس نے سوچا تھا، لڑکی گھبرا کے اپنی بغلیں جھانکنے لگے گی، لیکن اس کے خیال کے برعکس ـــــ وہ بغیر گھبرائے جلدی سے بولی:

"اس میں وولی کی سبز ساری ہے اور جس پر سنہری تلے کا کام ہے"۔

خالد کے حواس گم ہو گئے ـــــ پیکٹ کھول کر دیکھنے سے پہلے اس سے بھی پوچھا گیا لیکن زبان نے اس کا ساتھ نہ دیا ـــــ بڑی ہمت سے اس نے بھی وہی کہہ دیا جو لڑکی نے کچھ دیر پہلے کہا تھا۔ پیکٹ کھولا گیا ـــــ اور ایک بار پھر وہی ـــــ مسکہ ـــــ تب خالد

نے جلدی سے کیش میمو جیب سے نکال کر اُس لمبے شخص کے ہاتھ میں دے دیا جو سب سے پہلے ان کی طرف بڑھا تھا ——— اور ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا لڑکی نے بھی پرس سے کیش میمو نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا ——— تب پبلک بھی چکرا گئی ——— لیکن آخر فیصلہ تو ایک کے حق میں کرنا تھا ——— اور جو لڑکی کے حق میں ہو گیا۔

خالد وصی بڑی خاموشی سے اپنے اسٹاپ پر اُتر گیا۔

۳

جو میرے خوابوں، میری سوچوں، میری آنکھوں میں ہے
کیا ستم ہے اس کا مجھ سے رابطہ کوئی نہیں

وہ ساری کا پیکٹ سینے سے لگائے ہاتھ میں پرس جھلاتی اپنے گیٹ میں داخل ہوگئی ـــــ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی لان عبور کر کے برآمدے میں چڑھ آئی۔

"ممی ـــــ ممی جی" اس نے دو ایک بار پکارا ـــــ لیکن اُس کی ممی شاید قرب وجوار میں موجود نہیں تھیں ـــــ وہ بڑی مسرور سی آگے بڑھتی گئی ـــــ تب ہی ایک میلی ساری میں ملبوس ملازمہ کچن سے نکل کر باہر آگئی۔

"ممی کہاں ہے زبیدہ؟" وہ رُک کر پوچھنے لگی۔

"نماز پڑھ رہی ہیں" ملازمہ نے جواب دیا اور وہ سر ہلا کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔ ماں مالکِ حقیقی کے حضور سجدے میں گری ہوئی گڑگڑا رہی تھی۔ وہ غور سے ماں کو دیکھتی رہی۔ انہوں نے سجدے سے سر اٹھایا۔ ململ کے دوپٹے میں ان کے پر تقدس چہرے سے ایک نور سا پھوٹ رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ کر رخساروں پر پھیل گئے تھے ـــــ وہ لب دبا کر کچھ ضبط کرنے لگی ـــــ ماں نے سلام پھیرا ـــــ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے مصلا تہہ کیا اور اٹھ گئیں ـــــ پھر مصلا الماری میں

رکھ کر انہوں نے پیار سے بیٹی کی طرف دیکھا۔
"آ گئی ___ شہنو" ان کے لہجے سے مامتا اُمڈی پڑتی تھی۔
"جی ممّی ___" اُس نے مُسکرا کے کہا۔
"کیسی ساری لے کے آئیں، دکھاؤ تو ذرا" وہ شفقت سے بولیں۔
"بہت پیاری ہے ممّی، آپ دیکھیں گی تو......" وہ بات ادھوری چھوڑ کے پیکیٹ کھولنے لگی۔
"واہ وا، اس قدر خوبصورت ___ ماشاءاللہ" شہنا کے ہاتھوں پر پھیلی ہوئی سبز ریشم کی ساری دیکھتے ہوئے انہوں نے آنکھیں پھیلا کے کہا ___ "کس قدر حسین لگے گی میری شہنا پہ"
"ارے ممّی، بس تھوڑی بہت ___" وہ ہنس کے بولی ___ "اس قدر بھی نہیں ___" ساری تہہ کرتے ہوئے وہ الماری کی طرف بڑھی ہی تھی کہ کچھ یاد آیا ___ پلٹ آئی ___
"اور ہاں ممّی، جب رکشہ نہیں ملا ناں ___ تو......" ماں نے فوراً راہ میں بات پکڑ لی۔
"میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے شہنا، رکشہ، ٹیکسی میں اکیلی سفر نہ کیا کرو مگر تم اپنے آگے سمجھتی ہو کسی کو ___ تمہاری ضد نے بڑا پریشان کیا ہے شنّو ___ اب اگر شام کو چلی جاتیں اپنے ابّی کے ساتھ تو بھلا کون سی آفت آ جاتی"
"اللہ ممّی دن کتنے رہ گئے ہیں بھلا ___ پھر بلاؤز بھی ٹیلر کو دینا

تھا۔ ابھی ٹیلر شاپ سے ہو کر آرہی ہوں ۔ پرسوں تک ضرور آجائے گا ـــــ اور آپ ممّی پلیز ـــــ" اس نے لجاجت سے کہا ـــــ" فال لگا دیجیے گا ساری میں ـــــ وہ بھی میں ساتھ ہی لیتی آئی ہوں ـــــ اور ہاں ممّی سنیے تو ـــــ رکشا نہیں ملا تو دیکھیے بس میں کس قدر مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ـــــ ایک صاحب اچھے خاصے شریف مہذّب اور اس قدر اسمارٹ، قسم سے امّی ـــــ" مگر شہنا کی بات کو درمیان سے ہی کاٹ دیا گیا۔ یہ فون کی گھنٹی کی تیز آواز تھی۔ اس نے دوڑ کر ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو، کون صاحب؟" اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔" اچھا اچھا، جی کیا فرمایا ـــــ اوہ ـــــ ہائے اللہ ـــــ جی جی کچھ نہیں۔ وہ ہم شام کو لے جائیں گے ـــــ ہائے ممّی غضب ہو گیا ـــــ" ریسیور کریڈل پر رکھ کر اس نے انگلیوں سے ماتھا تھام لیا۔

"اُف خدایا، کس قدر انسلٹ ہوئی بے چارے کی، چچ چچ." اس نے افسوس سے کہا۔

"کیا ہوا؟" اس کی ماں نے پوچھا۔"کس کا فون تھا؟"

"ممّی ثناء اللہ والوں کا تھا ـــــ" وہ سر اٹھا کر آہستہ سے بولی.

"کیا کہتے تھے؟" ماں نے قریب آکر کہا۔

"وہ ممّی، میں اپنا پیکٹ دکان پر ہی بھول آئی تھی ـــــ اور ـــــ اور یہ ـــــ" وہ سخت پشیمان تھی. "اور یہ اُس بے چارے کا

ہے ممّی ــــ"

"کس بے چارے کا ــــ؟" ممّی جھنجلا سی گئیں ــــ "کیا بات ہے تم بتاتی کیوں نہیں ــــ"

اور تب شہنا نے ساری روئیداد بالتفصیل اپنی ماں کے سامنے بیان کر دی اور سر تھام کے بولی :

"ہائے، میں نے تو اس کی بڑی بے عزتی کی تھی ــــ اللہ اب کیا کیا جائے۔ اسے کچھ سُوجھ نہیں رہا تھا اور شرمندگی کا احساس تھا کہ اندر ہی اندر مار رہا تھا۔

"اب اس کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے کہ تم اخبار کے ذریعے اس بے چارے سے معافی مانگو؟" اس کی ماں نے منہ بنا کر کہا۔ پھر پیار سے سمجھا کے بولیں :

"چھوڑو اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ ساڑی سنبھال کے رکھ دو اُس کی امانت کے طور پر ــــ ماں یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی ــــ اور شہنا پریشانی کے عالم میں کھڑی رہ گئی، سخت پشیمان تھی۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس طرح اپنی غلطی کی تلافی کرے۔ رہ رہ کے اس کی صورت نگاہوں میں اُبھرتی تھی۔ گہری سیاہ آنکھوں والا حیران پریشان ــــ بھولا بھالا سا چہرہ ــــ "اُف" وہ تڑپ گئی ــــ "یہ کیا کیا میں نے ــــ وہ کیا سوچتا ہوگا۔ مگر کتنا اعلیٰ ظرف تھا ــــ آہ کس قدر خاموشی سے اتر گیا ــــ حق پر ہوتے ہوئے بھی ــــ اُف اللہ میاں مجھے معاف

کر دینا ــــ کاش کہ وہ مجھے ایک بار پھر مل جائے ــــ وہ سوچتی رہی اور پشیمان ہوتی رہی ــــ

اور زندگی کی پہلی رات تھی ــــ وہ جب نہ جانے کیوں شہناز کو رات بھر نیند نہ آئی ــــ کوئی جذبہ ہولے ہولے دل سے نکل کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگا ــــ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی ــــ

ادھر خالد بھی بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا ــــ وہ ایسی نہیں ہو سکتی ــــ وہ جو حوروں کی طرح پاک اور معصوم ہے، فریب کار نہیں ہو سکتی ــــ شاید ــــ شاید ــــ" وہ انگلیوں سے اپنا ماتھا بجانے لگا۔ "شاید وہ میرا پیکٹ نہیں تھا ــــ" پھر اُسے خود پہ ہنسی آنے لگی۔

"میاں جی، یہ لڑکیاں یوں ہی معصوم چہروں سے دھوکا دیتی ہیں۔ وہ زمانے گئے جب عورت اور جرم دو متضاد چیزیں تھیں ــــ آج تو عورتیں ہر وہ کام کر رہی ہیں جن کا کبھی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ــــ لیکن ــــ نہیں نہیں" اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "وہ ایسی نہیں ہو سکتی ــــ ضرور کوئی غلط فہمی ہے درمیان میں ــــ ورنہ کیش میمو اس کے پاس کیسے آیا ــــ" وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا ــــ "اوہ میں نے بے وقوفی کی ــــ" وہ بستر پہ اٹھ کے بیٹھ گیا ــــ "مجھے اُسے سٹور

تک لے جانا چاہیے تھا ___ مگر اس وقت شرمندگی کا احساس ہی مار رہا تھا۔ زندہ رہنے کی خواہش کسے تھی ___" اس نے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور بستر پر گر پڑا۔ مسافروں کے درمیان اپنی خالت کا تصور کرتے ہی یہاں تنہائی میں بھی پسینہ آنے لگا ___

"کاش، کاش ___ کہ اپنی غلطی کی تلافی کے لیے وہ ایک بار پھر میرے سامنے آئے ___ کاش، وہ سوچتا رہا ___

۴

فرشتہ ہے وہ مگر ہے زمیں کا باشندہ
کہ آدمی ہے مگر وہ خدا سا لگتا ہے

الوصی کی وسیع و عریض عمارت روشنیوں کے درمیان جگمگا رہی تھی ــــ سیٹھ اسمٰعیل وصی کی لاڈلی بیٹی نے اکیسویں برس میں قدم رکھا تھا اور جس کی خوشی میں سیٹھ جی نے اتنی بڑی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ گیٹ سے باہر WELCOME کے روشن الفاظ مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے ــــ لان میں تنے ہوئے رنگین شامیانوں میں مہمان کثیر تعداد میں پہنچ چکے تھے۔ لیکن سیٹھ کی حسین بیٹی زیبؔ وصی سفید زرتار غرارہ سوٹ میں خاصی بے چین سی گھوم رہی تھی ــــ کبھی وہ ایک میز کے گرد بیٹھی ہوئی اپنی سہیلیوں کی طرف جاتی اور کبھی گیٹ کی طرف ــــ پھر کبھی مہمانوں سے ملتی ــــ رسمی سی گفتگو کرتی ــــ اور پھر گیٹ کا طواف ــــ اس کا ماموں زاد اظہر خلیل اور اس کا اپنا بھائی خالد وصی ــــ خاصی دیر سے اُس کی ان حرکات کا جائزہ لے رہے تھے، مہمانوں سے نکل کر اس کی طرف بڑھ آئے ــــ زیبؔ نے انہیں آتا دیکھا اور مسکرا دی ــــ قریب آئے تو ہنس کے بولی :

"خاصے جچ رہے ہیں آپ لوگ ــــ"

آسمانی رنگ کے جدید تراش کے سوٹ اظہر اور خالد دونوں پر جچ

رہے تھے ــــــ خالد شرارت سے ہنس کے بولا :

" اپنی تعریف کروانا چاہتی ہے ــــــ غالباً زیبا ــــــ مگر کیا کیا جائے غرارے میں تم بالکل اچھی نہیں لگتیں ــــــ بہن جی ــــــ " وہ منہ بسوس کر بولا .

" اس وقت جانے دیتی ہوں " اس نے لب بھینچ کے کہا ــــــ " بعد میں سمجھوں گی "

" اور یہ اس قدر پریشان حال کیوں ہو جی ؟ " اظہر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا ۔

اُس نے گھور کے اظہر کی طرف دیکھا پھر ایک دم مسکرا دی : " مجھے کسی کا انتظار ہے " بڑے انداز سے بولی ۔

" وہ تمہاری بلی ، خرگوشنی ، مینڈکی اور چھچھوندر وغیرہ تو سب موجود ہیں ۔ آخر تمہیں کس کا انتظار ہے " وہ ہنس کے بولا ــــــ " شاید کوئی نئی دوست " خالد گنگنایا ۔

" جی آپ کو کوئی اعتراض ہے " وہ کاٹ کھانے کے انداز میں بولی ۔

" نہیں جناب " وہ سر جھکا کے بولا ۔ " بندہ یہ جرأت کہاں کر سکتا ہے "

" سچ بتاؤ زیبا ، کس نے آنا ہے ؟ " اظہر نے سنجیدہ ہو کے کہا ۔

" میری ایک بہت ہی پیاری سہیلی ہے جناب ــــــ آپ دیکھیں گے تو ــــــ " پھر خود ہی بات ادھوری چھوڑ کے چپ ہو گئی ۔

"پہلے یہ بتاؤ ۔" خالد آہستہ سے بولا ۔ "دوستی کسی دکان میں ہوئی تھی یا ٹرک پر ـــــ یا شاید تم نے اپنی گاڑی میں اُسے لفٹ دی ہو ـــــ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابھی پچھلے دنوں وہ تمہیں بس کے سفر کے دوران ملی ہو ـــــ"

"اونہہ، بس کے سفر کے دوران ملی ہو ۔" زیب منہ بگاڑ کے بولی ۔ "وہ آپ ہی کی ہوتی ہوگی بس کے سفر کے دوران ـــــ دوستی ۔"

اور خالد کے لبوں پر دھیمی سی مُسکان اُتر آئی ـــــ ایک بھولا بھالا معصوم سے حسن والا چہرہ نگاہوں میں آگیا ـــــ زیب اپنی سہیلی کے بارے میں انہیں بتاتی رہی ـــــ اظہر بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا ۔ مگر خالد وہاں نہیں تھا، خیالوں ہی خیالوں میں کہیں اور چلا گیا تھا ۔

"ہائے وہ آگئی ـــــ" زیب زور سے چیخی اور خالد چونک گیا ۔

"کون ؟" اس نے بھاگتی ہوئی زیب کا بازو تھام لیا ۔

"ارے سارہ بھیا ۔" وہ مُڑ کے بولی ۔

تب ہی خالد کی اٹھی ہوئی نگاہیں ٹھٹک گئیں ـــــ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ سبز ریشم کی ساری میں لپٹی ہوئی ـــــ جو معصوم سی دوشیزہ سبک خرامی سے چلتی ہوئی ان کی طرف آرہی ہے ـــــ وہی اس کے خیالوں میں حشر بپا کر دینے والی بے ضرر سی لڑکی ہے ـــــ

زیب بازو چھڑا کے سہیلی کی طرف بڑھ گئی تھی ۔ وہ درخت کے تنے سے لگا ایک ٹک اُسے دیکھتا رہا ـــــ یہی حال اظہر کا تھا ـــــ وہ

زیب کے ساتھ ہنستی مسکراتی بدستور باتیں کرتی ہوئی چلی آرہی تھی اور ہنستے ہوئے چہرے پر وہ دو روئی روئی سی آنکھیں ــــ اس کا دل کھنچنے لگا۔ تب ہی وہ آنکھیں اُٹھ گیئں ــــ گھنیری پلکیں جھپک کے رہ گیئں۔ قدم رُک سے گئے ــــ خالد کے لبوں پر گہری مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

"کیوں سارہ۔" زیب حیرانی سے بولی۔ "کیا ہوا؟" پھر اس کی نگاہ بھائی کی جانب اٹھی اور حیران نگاہیں مسکرادیں۔

"کیا تم بھیّا کو پہلے سے جانتی ہو سارہ؟"

"آں ــــ ہاں ــــ" وہ ہوش کی دنیا میں آگئی۔ "ہاں زیب" اس نے ہولے سے کہا۔ "اور میں سخت شرمندہ ہوں اُن سے ــــ آؤ میں تمہارے بھیّا سے معافی مانگ لوں ــــ"

زیب نے قدرے تعجب سے اُسے دیکھا ــــ خالد خود ہی ان کی طرف بڑھ آیا تھا۔

"تسلیم عرض کرتا ہوں۔" وہ مسکرا کے بولا۔

"السلام علیکم۔" بوکھلا کر اس نے بھی سلام کر ڈالا۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔" وہ جُھک کے بولا۔

"ہمیں اور شرمندہ نہ کریں۔" وہ اس کی بات کاٹ کے سر جھکاتے ہوئے بولی۔ "یقین مانیے ہم بے حد پشیمان ہیں۔ ہمیں غلط فہمی ہوگئی تھی۔"

"جی، کیسی غلط فہمی؟" وہ تجاہل عارفانہ برت رہا تھا۔

"مجھے تو بتائیں آخر بات کیا ہے؟" زیب نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا ——— اور تب وہ دھیمی آواز میں مختصراً اُسے تمام روئیداد بتانے لگی۔

خالد ہنسنے لگا ——— پھر لاپروائی سے بولا:
"چلیئے بھول جائیے اُس قصّے کو، فی الوقت تو اس بات کا جشن منایا جائے کہ آپ ہماری زیبا خانم کی دوست نکل آئیں۔"
"اور نہ جانے کہاں کہاں سے نکل آتی ہیں۔" اظہر زیرِلب بڑبڑایا۔
"اجی ———" اس نے دبی آواز میں اُسے تنبیہ کی ——— پھر سہیلی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کے بولی:
"یہ ہمارے ماموں زاد ہیں ——— اظہر خلیل صاحب اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے۔" وہ اظہر سے مخاطب ہوئی:
"یہ شہناساحرہ ہیں ——— ایسی ویسی نہیں ——— بلکہ ہمارے بچپن کی ساتھی ——— سمجھے۔"
"بچپن۔" خالد نے زیرِلب کہا اور سارہ کی طرف دیکھنے لگا جس کے چہرے پر دھیمی سی مسکان بچپن کا تصوّر کر رہی تھی۔
"جی ہاں، آج سے کئی برس پیشتر جب ہم ووڈ سٹریٹ میں رہتے تھے۔"
"ووڈ سٹریٹ۔" خالد کا خیال اُڑنے لگا۔ "آج سے نو برس پیشتر جب ابو کا ریٹائرمنٹ نہیں ہوا تھا۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"جی —" زیب نے ہونٹ ٹیڑھے کر کے کہا۔ "یہ وہی شہنی ہے آپ کے چچا غوری کی صاحبزادی۔"

مگر خالد نے زیب کی بات نہیں سنی تھی۔ وہ پھر کہیں چلا گیا تھا۔ اس دَور میں جسے لڑکپن کا کھلنڈرا زمانہ کہا جاتا ہے — اور اس زمانے میں وہ نیا نیا کالج میں آیا تھا اور وہ شاید ساتویں جماعت میں تھی۔ بارہ تیرہ برس کی روئی روئی آنکھوں والی معصوم سی لڑکی — اُس کے خیالوں میں در آئی۔ وہ سوچنے لگا۔ کالج کے زمانے میں لڑکے کیسے کیسے افسانے تراشا کرتے تھے، لڑکیوں کے متعلق اور شاید وہ خود بھی — مگر شہنا ساحرہ کی معصوم ہستی کو اس نے بڑے تقدس سے چاہا تھا اور جو — ابھی تک اس کے من میں بس رہی تھی۔

اس نے نگاہ اٹھائی — شہنا خاصے غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ زیب بدستور بول رہی تھی۔ "چچا غوری اور چچی — الّو کو الفنسٹن سٹریٹ پر مل گئے تھے —"

سٹریٹ کے ساتھ اپنا نام لیتے ہوئے شرم آتی ہے۔" وہ مسکرایا۔

"ہوں، کیسے چہکنے لگے۔" زیب نے منہ بنایا۔ پھر سارہ سے مخاطب ہو کر بولی:

"ایسا بنتے ہیں — شہنی — بھیّا کہ کیا بتاؤں — بڑا اپنے آپ کو فن کار سمجھتے ہیں۔ الٹی سیدھی تصویریں کیا بنا لیتے ہیں، نہ جانے کیا سمجھنے لگے ہیں اپنے آپ کو — اب اس دن میں نے بتایا تھا

کہ اَبّو کو چچا غوری ملے تھے مگر نہ جانے کہاں اڑا کرتے ہیں جنابِ والا کے دماغ ــــــ" خالد خاموشی سے مسکراتا رہا ــــــ

"ہوں، تو یہ ہیں خالدی بھیّا ــــــ" شہنا نے پھر خالد کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں ــــــ اور شہنا زیب سے مخاطب ہوئی:

"کیا اندر نہیں چلنا زیبو ــــــ"

"ہاں آؤ، میں تمہیں اپنی دوستوں سے ملاؤں" زیب نے اس کا بازو تھاما اور اظہر ہولے سے بول پڑا:

"مگر کچھ سنبھل کے زیبا ــــــ کبوتری، مینڈکی، خرگوشنی، بلّی اور چھچھوندر سے کہیں ڈر نہ جائے"

"لیجیے نیا خطاب آپ کی دوستوں میں ــــــ" خالد نے ایک قہقہہ لگایا ــــــ اور زیب اظہر کو گھورتی ہوئی ــــــ شہنا کے ساتھ آگے بڑھ گئی ــــــ

۵

چند کلیاں نشاط کی چن کر مدتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تجھ سے ملنا خوشی کی بات سہی تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

اظہر خلیل ایک شوخ طبیعت نوجوان تھا۔ زیب کے ساتھ اکثر اس کی نوک جھونک رہتی تھی ــــ لیکن یہ سب ہی جانتے تھے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے منسوب ہیں۔ زیب نے ظاہرا کبھی کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا ــــ لیکن ایک جذبہ تھا ــــ کہ وہ اپنی تمام حرکات کے باوجود اُسے پسند تھا ــــ وہ ایک دل پھینک قسم کا لڑکا تھا۔ خاصی پرکشش شخصیّت کا مالک تھا۔ گفتگو کا فن بھی اُسے آتا تھا اور لڑکیاں اکثر اس کی خوبصورت باتوں کے جال میں اُلجھ بھی جاتی تھیں جن کی کہانیاں وہ بڑے فخر سے لطف لے کر زیب اور اس کی سہیلیوں کو سنایا کرتا تھا۔ پھر شہنا بھی اس کی سہیلیوں میں شامل ہوئی اور یوں اس سے بھی کچھ پوشیدہ نہ رہا ــــ لیکن نئی نسل کے نوجوانوں کی اس روش سے شہنا بڑی بیزار تھی ــــ اُس نے بہت قریب سے ان دو نوجوانوں کو دیکھا تھا اور اسے نہ جانے کیوں دلی مسّرت ہوئی تھی۔ جب اُس نے محسوس کیا کہ خالد ایک مثالی نوجوان ہے، دوسرے نوجوانوں سے قطعی جُدا ــــ وہ بڑے ضبط سے اظہر کے بیان کیے ہوئے کارناموں کی تفصیلات سنا کرتی ــــ پھر اُسے مردوں سے زیادہ حوّا کی ان بیٹیوں پہ طیش آتا، جو اپنی ہستی کو اس قدر

پستی میں اتار دیتی ہیں اور نسوانیت کے پندار کو چکنا چور کر ڈالتی ہیں ـــــ
پھر ایک دن یہ کھولتا ہوا لاوا ضبط کی حدود سے تجاوز کر گیا ـــــ اظہر نے سکول کی کسی معصوم لڑکی کو فریب سے اُلجھایا تھا ـــــ اپنے خون سے خط لکھ کر اور اُس کے پاکیزہ آنچل کی قسمیں کھا کر ـــــ اور وہ ایک کچے ذہن کی بھولی بھالی لڑکی ایک مرد کے آنسو دیکھ کر اپنی پاکیزگی کو مجروح کرنے چلی تھی ۔اس نے بڑے تحمّل سے کہا :

" اظہر بھیّا ـــــ آپ کی شخصیت بلاشبہ متاثر کن ہے ـــــ تعجّب نہیں کہ وہ کیوں آپ سے متاثر ہو جاتی ہیں ـــــ لیکن آپ کی یہ روش مردانگی کی توہین ہے بھیّا ـــــ آپ اپنی شخصیت کو گرا رہے ہیں اور محبّت کے جذبے کو پامال کر رہے ہیں ۔ یقین کیجیے اچھی لڑکیاں ایسے نوجوانوں کی قدر نہیں کرتیں "۔

اظہر مسکرایا اور پلٹ کر زیب کی طرف دیکھنے لگا ـــــ اور خالد سنجیدہ نگاہوں سے اس سیدھی سادی معصوم لڑکی کو گہری نظر سے دیکھ رہا تھا جو اس وقت کوئی اچھی خاصی مبلّغ معلوم ہوتی تھی ۔

وہ اکثر الوصی چلی آتی تھی ۔ کبھی کبھار خالد سے بھی ملاقات ہوتی تھی اور وہ دن خالد کے لیے بڑا خوشگوار ہوتا ـــــ خواہ اس پر کسی قدر اداسی کیوں نہ طاری ہوتی وہ شہنا کا چہرہ دیکھ کر تازہ دم ہو جاتا اور یہ اداسی کے دورے بھی اسے خواہ مخواہ پڑا کرتے تھے ـــــ نہ جانے شہنا کا خیال آتے ہی وہ اس قدر اداس کیوں ہو جاتا تھا ـــــ اور یہ اتفاق ہی ہوتا

کہ جس دن اُس کی اُداسی عروج پر ہوتی ـــــ تنہا چلی آتی اور وہ خود بخود بڑبڑا اُٹھتا :

؎ چند کلیاں نشاط کی چُن کر مدتوں محوِ یاس رہتا ہوں !
تجھ سے ملنا خوشی کی بات سہی تجھ سے ملکر اداس رہتا ہوں

اور سردیوں کی وہ شام بھی اس کے لیے خاصی سوگوار تھی ـــــ آج اس کی تصویر فی البدیہہ تصویری مقابلے میں اول آئی تھی ـــــ مگر نہ جانے کیوں شوخ رنگوں سے ترتیب دیتے ہوئے اس کا بُرش بہک کیوں گیا ۔ اپنے محبوب کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتی ہوئی دوشیزہ ـــــ نہ جانے کیوں اس شکستہ سے مزار پر چراغ جلانے لگی ۔ سرخ پھول شعلے بن گئے ـــــ جو اُسے جلانے کے لیے لپک رہے تھے ۔

پرنسپل کے ہاتھ سے کپ تھامتے ہوئے اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں ـــــ اور چہرے پر گہری اداسی کے تاثرات تھے ـــــ زندہ دل پرنسپل علی مشہدی نے مسکرا کے اُسے دیکھا، پھر اس کی تصویر کی طرف نگاہ کی ـــــ جھک کے آہستہ سے بولے :

"آپ کو کوئی دُکھ ہے خالد وصی ؟"

"دُکھ ؟" اُس نے پرنسپل کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے مسکرا دیا ۔

"ہر فن کار کو ہر پہلو سے آشنا ہونا چاہیے ـــــ ورنہ میرے خیال میں وہ ایک سچا فن کار نہیں بن سکتا اور مجھے کوئی دکھ نہیں ـــــ شاید اسی لیے میں خود کو کامیاب محسوس نہیں کرتا ۔" اس نے آہستگی سے

کہا۔ معمر علی مشہدی ہنس دیے۔

"کہتے تو تم صحیح ہو صاحبزادے ـــــ مگر خدا نہ کرے کہ تمہاری زندگی کو کسی دکھ سے واسطہ پڑے ـــــ اور کون کہتا ہے کہ تم ناکام ہو، ابھی ابتدا ہے۔ انشاء اللہ آگے چل کے دُنیا کے غم و آلام سے واسطہ پڑے گا تو اپنے دکھ کی تمنا نہیں رہے گی۔"

اور وہ سوچ رہا تھا۔ "کیا واقعی اُسے کوئی دکھ ہے ـــــ مگر وہ کیا دکھ ہے۔" وہ ہنس دیا۔ "کیسا عجیب دل ہے جو دُکھ کا منتظر ہے۔ کیا یہ کوئی چھٹی حِس ہے ـــــ جو یوں اُداسی کی لہر اس کی زندگی میں لے آتی ہے ـــــ ورنہ اس کی زندگی میں غم کو کیا دخل؟ اس کا باپ ایک بڑا سرمایہ دار ہے۔ اُسے دُنیا کی ہر آسائش مہیا ہے ـــــ ایک پیار کرنے والی بہن ہے ـــــ دوست احباب ہیں۔" اور وہ سوچنے لگا۔ شہنا ساحرہ کے ساتھ ملاقات سے پہلے یقیناً میری زندگی ہر فکر سے آزاد تھی ـــــ کبھی کبھار برش کینوس پر پھیرتا تو کوئی شوخ سا سایا اُبھرتا ـــــ زندگی ہنستی مسکراتی رواں دواں تھی ـــــ مگر یہی بے ضرر سی لڑکی نہ جانے کیوں اُس کی زندگی کو ایک روگ لگا بیٹھی تھی۔ بظاہر وہ بھی اس کے ساتھ ہنستی بولتی تھی ـــــ مگر نہ جانے کیوں اس کے ہنستے ہوئے چہرے پر ان دو روئی روئی سی آنکھوں میں اُسے اپنا مستقبل سِسکتا نظر آتا ـــــ لیکن پھر بھی وہ خواہ مخواہ کے اس خیال پر خود ہی ہنسنے لگتا ـــــ اور اُس نے سوچا اس بے کار سے خیال کو وہ اپنی زندگی سے نکالنے کی کوشش

کرے گا ۔۔۔ اپنے کمرے سے نکل کر وہ باغیچے میں اُتر آیا ۔۔۔ پھر اُس حصّے تک چلا آیا جو زیب کی کوششوں سے گہوارۂ جنت بنا ہوا تھا ۔۔۔ حسین و خوبصورت، خوش رنگ پھول عجیب بہار دکھا رہے تھے ۔۔۔ وہیں زیب کے کمرے کی بڑی کھڑکی کھلتی تھی، گلاب کے پھولوں کی ٹہنیاں کھڑکی تک جا کر کمرے میں جُھک گئی تھیں کھڑکی میں جاتی ہوئی ٹہنی میں ایک حسین سی ادھ کھلی کلی ۔۔۔ کی مدھر مہک نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا مگر اس سے پہلے کہ اس کی انگلیاں کلی کو چھوتیں ۔۔۔ اس کی نگاہ کھڑکی کے اندر اُتر گئی ۔۔۔ وہ بھی بلا شبہ ادھ کھلی گلاب کی کلی تھی اور پہلی سے کسی قدر حسین ۔۔۔ شہنا کا صبیح چہرہ سامنے تھا۔ سوچتے ہوئے خوب صورت لب تھوڑا سا کھل گئے تھے ۔۔۔ کسی جانور کی کھال سے بنا ہوا سفید کوٹ اور پیازی ساری میں اس کا معصوم حسن کھلا جا رہا تھا ۔۔۔ اُس کے چہرے پر مدھم مسکان کسی حسین سوچ کی مظہر تھی لیکن اس مسکراتے ہوئے چہرے پر گھنیری پلکوں میں ساکت گہرے پانیوں کے سے رنگ کی آنکھیں، لگتا تھا ۔۔۔ ابھی برس پڑیں گی۔ اُس کے خوبصورت موڈ پر اداسی کی ہلکی سی تہہ آ گئی ۔۔۔ اور وہ پلٹ گیا ۔۔۔ پھر زیب کو تلاش کرتا ہوا کچن کے دروازے تک آ گیا جہاں وہ چائے کے لیے چپس تل رہی تھی۔

"اوہ، آپ آ گئے بھیا!" وہ اُسے دیکھ کے بولی۔ "سارہ آئی ہے، میرے کمرے میں ہے ۔۔۔ دیکھیے کہیں بور نہ ہو رہی ہو!"

"کیوں مائی رحمت کہاں ہے؟" وہ خلافِ معمول بہن کو کچن میں

دیکھ کے بولا۔

"ہوں گی یہیں کہیں ــــ" وہ لاپروائی سے بولی۔

"ہوں تو آج یہ شوق اٹھا تھا آپ کو!" وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا ــــ زیب کے کمرے کے دروازے پر رُک کے اس نے آہستہ سے پوچھا:

"اجازت ہے؟"

شہناؔ چونک گئی، پھر مُسکرا کے بولی:

"آیئے ناں ــــ اپنے ہی گھر میں اجازت۔"

وہ کچھ نہیں بولا ــــ بغور اسے دیکھتا رہا ــــ گہری سیاہ آنکھوں کی حدّت سے شہنا جیسے پگھل گئی۔ اپنا آپ سمیٹ کے بمشکل بولی:

"بیٹھیے۔"

وہ اندر چلا آیا ــــ ایک گہرا سانس بھر کر بولا:

"جب آپ اس گھر میں آجاتی ہیں، میں خود کو اجنبی سا محسوس کرنے لگتا ہوں۔ اس گھر میں ہر طرف مجھے آپ ہی آپ نظر آتی ہیں۔"

شہنا کا دل دھڑک اٹھا ــــ مگر یوں انجان بن گئی جیسے کچھ نہ سمجھی ہو ــــ وہ دوسری کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا ــــ خاصی دیر کمرے کی فضا پر خاموشی کا تسلّط قائم رہا، پھر اس نے کہا:

"اجّی کو آپ نے خاصا پزل کیا ــــ اُسے جواب نہیں بن پڑا ــــ"

شہناؔ مسکرا دی۔ وہ پھر بولا:

"لیکن شہنا، آپ محبّت کے جذبے سے تو منکر نہیں ہوں گی۔"

"جی نہیں۔" وہ خود اعتمادی سے بولی۔ "اس جذبے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اب یہ بات الگ ہے کہ لوگوں نے ابوالہوسی کو اس پیارے جذبے کا نام دے کر بدنام کر دیا اور یہ نام زبان پر لاتے ہوئے اب حیا آتی ہے۔" وہ مسکرانے لگا۔

"ایک بات بتائیں سارہ ــــ اگر ایک شخص کسی سے محبّت کرتا ہے عمر کے اس دور سے ــــ جب وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے ــــ کہ محبت کا مفہوم کیا ہے ــــ بچّی معصوم تھی ــــ لیکن وہ اس کی خاموش پرستش کرتا رہا ــــ اس جذبے کو آپ کیا نام دیں گی؟"

"جو جذبے معصوم دلوں سے جنم لیتے ہیں، میرے نزدیک وہ کبھی جھوٹے نہیں ہوتے۔"

"شکریہ۔" وہ زیرِ لب بولا۔

شہنا نے چونک کے اُسے دیکھا، پھر سر جھکا لیا ــــ کچھ دیر وہ چپ رہا، پھر آہستہ سے بولا:

"اگر کوئی آپ سے پیار کرتا ہو؟"

شہنا پلکیں پھیلا کے اُسے دیکھتی رہ گئی ــــ کوئی شے دل کے قریب پھوٹ کر رگوں میں سرایت کر گئی۔ کپکپا کے رہ گئی مگر چند لمحے بعد جب بولی تو لہجے میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔

"میں اس شخص کے بارے میں جاننا چاہوں گی کیونکہ ــــ" وہ

رُک کر بہت سنجیدگی سے بولی "میرے خیال میں بلا جانے بوجھے کسی شخص کے بارے میں رائے نہیں دی جا سکتی۔"

"فی الحال وہ خود کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔"

"کیوں ـــــ ؟"

"اس لیے کہ ناکامی سے خوف کھاتا ہے۔" اُس نے اداسی سے کہا۔ "ویسے میں آپ کو بتا دوں سارہ ـــــ وہ پیار کو کھیل نہیں بنانا چاہتا، آپ کو اپنانے کا متمنی ہے اور میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنا قدم آگے بڑھائے یا نہیں ؟"

"میں بڑھنے والے قدم کو ـــــ جو کسی بُرے مقصد کے لیے نہ ہو ـــــ روکنے کے سراسر خلاف ہوں۔"

"اور اگر وہ ـــــ مایوس رہا۔"

"مایوسی یا کامیابی ـــــ تمنا کی حیات ـــــ یا آرزو کی موت ایک اٹل حقیقت ہو گی ـــــ اور حقیقت سے نگاہ چرانا ـــــ میرے نزدیک بزدلی ہے۔"

وہ اداس ہوتے ہوتے نہ جانے کیوں ہنس پڑا۔

"آپ کے پاس دل بھی ہے یا نہیں ؟" اس نے جُھک کے شرارت سے پوچھا۔

"اللہ کے فضل و کرم سے صحیح و سالم موجود ہے۔" وہ بھی مسکرا دی۔

"اگر کوئی مانگے تو سوالی کو مایوس لوٹا کے آپ اس کی تمناؤں کا

خون کرنا پسند کریں گی ـــ یا ـــ" اس نے خود ہی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"یوں تو سوالی بہت ہیں"۔ شہنا کے اس جملے نے اُسے افسردہ کر دیا۔ وہ کہتی رہی "۔ مگر ہم نے یہ امانت صرف ایک شخص کے لیے محفوظ کی ہے۔ وہ جو ہمارا شوہر کہلائے گا۔ جسے زمانہ اور خدا ہمارے نام سے وابستہ کر دے گا، وہی اس کا حق دار ہو گا"۔

"یہ تو مشرق کی مجبور عورتوں کی روایت دُہرا رہی ہیں آپ"۔ وہ ہنسنے لگا۔ "لیکن ماشاءاللہ آپ خود اپنی مختار ہیں ـــ تعلیم یافتہ ہیں بھلا بُرا سمجھتی ہیں۔ آپ کو اپنی پسند کا اختیار ہے"۔ اس نے آخری جملے پر زور دے کر کہا۔ "پھر یوں تو جذبۂ الفت کی کوئی حیثیت ہی نہ رہی وہ جذبہ جو دلوں سے جنم لیتا ہے ـــ محض زبردستی کی محبت بن کے رہ جائے گا"۔

"میں آپ کا مطلب سمجھتی ہوں"۔ وہ آہستہ سے بولی "۔ لیکن اس دلی جذبے سے مقدم ایک شے اور ہے ـــ اور وہ ہے عزت۔ ہمارے والدین کی عزت، ہمارے خاندان کی عزت اور خود عورت کی اپنی عزت ـــ اور جس پر یہ پاکیزہ جذبہ بخوشی قربان کیا جا سکتا ہے"۔ وہ خاموش ہو کے کچھ سوچنے لگی ـــ پھر یک لخت موضوع بدل کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "مگر یہ آپ کس بحث میں اُلجھ گئے۔ زیبا نے بتایا تھا۔ آج آپ کا تصویری مقابلہ ہے ـــ کوئی خوشخبری

یا ــــ" اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
"یا ــــ" وہ زبردستی مسکرایا۔ "یہ چیز میرے کمرے میں ہے"۔
اور جب ہی زیب چائے اور دوسرا سامان ٹرے میں اُٹھائے اندر داخل ہوئی ــــ ہنس کے زور سے بولی:
"اور جو ــــ ایک خوبصورت چاندی کے کپ کی شکل میں ہے اور جس کا دیدار میں ابھی بھیّا کے کمرے سے کر کے آ رہی ہوں"۔
اس نے ٹرے میز پر رکھی ــــ اور جھک کر چائے بنانے لگی۔

۶

پاس رہ کے بھی ہمیشہ وہ بہت دُور مِلا
اُس کا اندازِ تغافل ہے خداؤں جیسا

۲

آئینے کی سطح پر ابھرتے ہوئے اپنے عکس پر شہنا نے ایک نظر ڈالی اور کنگھا اٹھا کے بالوں میں پھیرنے لگی۔ پرنٹڈ فلیپر — زرد گھیردار خوب صورت شرٹ پر سیاہ کوٹی اور کاسنی دوپٹے میں وہ خود اپنی نگاہ کو اچھی لگی — سیاہ بالوں کو گلابی رنگ کے ریشمیں رومال میں سمیٹتے ہوئے اس نے محسوس کیا۔ جیسے نیچے کوئی گاڑی رُکی ہو اور کال بیل کی تیز آواز پر وہ جلدی سے اُٹھ کے کھڑکی میں آ گئی — اور واقعی نیچے گیٹ پر سیاہ امپالا موجود تھی — چاکلیٹی پینٹ اور سفید سوئیٹر میں خالد روزانہ سے زیادہ حسین لگ رہا تھا — اُسی لمحے اس کی نگاہیں اوپر شہنا کی کھڑکی کی طرف اٹھیں —

"نیچے آؤ" اُس نے مُسکرا کے ہاتھ سے اشارہ کیا — اور وہ لب دبا کر کھڑکی سے ہٹ گئی — نیچے آئی تو اس کی ماں خالد کو ڈرائنگ روم میں بٹھا چکی تھی۔ اُس کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی اُس کے قدموں کی آہٹ سُن کے انہوں نے آواز دی:

"شنو بیٹیا یہاں تو آؤ —" وہ اندر داخل ہوئی تو بولیں: "تمہاری سہیلی بہت بیمار ہے۔ خالد میاں تمہیں لینے آئے ہیں"

"اچھا" وہ ایک دم گھبرا گئی۔ "تو پھر میں جاؤں ممی"

"ہاں برابر سے بے بی کو ساتھ لیتی جاؤ"۔ انہوں نے کہا اور وہ جلدی سے دوپٹہ سنبھالتی ہوئی باہر نکل گئی ——— اور برابر والی بچّی کو لیکر جب وہ باہر نکلی تو خالد ڈرائیونگ سیٹ پر اس کا منتظر تھا ——— وہ ماں کی طرف سے جلد آنے کی تاکید سُنتے ہوئے گاڑی کا پچھلا پٹ کھول کے اندر بیٹھ گئی ——— راستہ خاموشی سے طے ہوا لیکن سامنے آئینے کی سطح سے جب بھی شہنا کی نگاہ ٹکراتی خالد کی نگاہیں اُسے بولتی ہوئی محسوس ہوتیں ——— اور تب وہ رخ پھیر کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی۔ الوصی پہنچے تو اظہر کے ساتھ خالد کے دو دوست بھی وہاں موجود تھے ——— اور زیب بڑے اطمینان سے دریچے میں کھڑی سلائیاں چلا رہی تھی۔ اُسے اچھا بھلا دیکھ کے شہنا کے لب بھینچ گئے ——— اور بے بی کے ننھّے ہاتھ پہ اُس کی گرفت سخت ہو گئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ پلٹتی، زیب نے دوڑ کے اُسے لپٹا لیا:

"معاف کر دے ڈیئر ———" اس نے لجاجت سے کہا۔ "قسم سے شنّو جی، اس قدر کمی محسوس ہو رہی تھی تمہاری ———"

"کس کو ؟" اظہر نے شرارت سے کہا۔

زیب نے گھور کے اُسے دیکھا اور سارہ کو ساتھ لیے ہوئے سامنے صوفے کی طرف بڑھ گئی۔

"یہ خالدی بھیّا کے دوست وحید آفاق اور شعیب علی ہیں" اُس

نے تعارف کروایا ـــــ "اور یہ میری پیاری سہیلی شہنا ساحرہ "

"جی تعریف تو بہت سنی ہے "۔ وحید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن یقین جب آئے گا اگر ہمارے معلم سے جیت سکیں ـــ "

" ہاں آپ بہت دلچسپ پہیلیاں بیان کرتے ہیں "۔ زیب نے شہنا کو بتایا۔

" پہلے چائے تو ہو جائے "۔ اظہر نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ " پھر دوسرا دور چلے "۔

" جاؤ زیبا "۔ خالد نے مسکرا کے کہا۔ " کہہ آؤ چائے کے لیے "۔

زیب اُٹھی تو سارہ نے بھی اُس کے ساتھ ہی اپنی جگہ چھوڑ دی ـــ اُن کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد ملکہ چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی آگئی ـــ اُس نے سب کو چائے بنا کر دی اور چائے کے دوران میں زیب نے اشتیاق سے کہا:

" ہاں تو شعیب بھائی ـــ کوئی بہت ہی دلچسپ پہیلی "۔

" لیکن اُلجھی ہوئی ـــ " اظہر نے کہا۔ " شہنا باجی کا امتحان مقصود ہے ـــ "

" اس قدر گاڑھی اردو نہ بولا کرو خدا کے لیے "۔ زیب نے منہ بنا کے کہا۔ " تمہارے اوپر ذرا بھی نہیں جچتی "۔

" ارے لو، اس پہ مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا "۔ اظہر جلدی سے بولا۔

"تو چلیے پھر پہلے آپ ہی شروع ہو جائیے۔" شعیب ہنس کر بولا۔

"باری باری مہربان ——" اظہر نے سر ہلا کے کہا۔ پھر خود ہی چونک کے بولا: "اور لو، اس پہ ایک دوسرا لطیفہ یاد آگیا —— مگر پہلے یہ سن لو —— پھر ——"

"چلو چلو جلدی کرو۔" خالد نے کہا تو وہ ایک لمحہ رُک کے بولا۔

"ایک مولوی صاحب حلوائی کی دکان پر گیا اور اپنی زبان میں یعنی حلق سے آواز نکال کے بولے:

'شیرا ہے'؟

حلوائی بولا: 'ہے تو سہی مگر اس قدر گاڑھا نہیں ہے'۔ اور دوسرا لطیفہ۔" وہ جلدی سے بولا:

"ایک ہوٹل کے مالک نے ایک طوطا پال رکھا تھا۔ گاہک زیادہ تعداد میں آجاتے تو اسے بڑی پریشانی ہوتی اور اس نے طوطے کو رٹا دیا وہ ہر وقت چلاتا رہتا۔ "باری باری آیئے مہربان، باری باری آیئے"۔ ایک دن طوطے کا پنجرہ کھلا رہ گیا۔ طوطا اڑ گیا۔ ایک جنگل میں بہت سے کوّوں نے اُسے گھیر لیا اور اسے بُری طرح چونچیں مارنے لگے اور طوطا پتا ہے کیا چلا رہا تھا۔ "باری باری آیئے مہربان، باری باری آیئے۔"

"بہت پرانا ہے۔" زیب نے ہاتھ نچا کے کہا —— اور سب ہنس پڑے۔

"مولوی پہ مجھے ایک اور لطیفہ یاد آیا تھا۔ لگے ہاتھوں وہ بھی سُنا دوں۔"

"بس رہنے دو۔" زیب نے اُسے گھورا۔ "بس جی، آپ شروع

کریں ــــ شعیب بھائی ــــ" اظہر شرمندہ ہوئے بغیر بولا۔

"ایک غیر ملکی سیاح ہے جناب ــــ" شعیب نے شہنا کی طرف دیکھ کے کہا۔ "وہ ایک باغ میں سیر کے لیے گیا جو لیمو کا تھا۔ باغ کے پہلے دروازے پر کھڑے ہوئے چوکیدار نے اُسے روک لیا اور اندر جانے کی شرط یہ لگائی کہ جتنے لیمو وہ توڑے گا آدھے اس کے ہوں گے ــــ غیر ملکی سیاح نے کہا ــــ مجھے منظور ہے ــــ مگر ایک میری بھی شرط ہے اور وہ یہ کہ آدھے لیموں کے تم صرف ایک مجھے واپس کر دینا ــــ چوکیدار تیار ہو گیا۔ سیاح آگے بڑھا۔ باغ کے دوسرے دروازے پر دوسرا چوکیدار ملا۔ اس سے بھی یہی شرط طے ہوئی ــــ اسی طرح باغ کی سیر کرتے ہوتے اُسے پانچ چوکیدار اور ملے ــــ اور سب سے یہی شرائط طے ہوئیں ــــ سیاح نے لیمو توڑے ــــ اور طے شدہ شرائط پوری کرتا ہوا جب وہ باغ سے باہر نکلا تو اُس کے پاس دو لیمو تھے ــــ بتاؤ اُس نے کل کتنے لیمو توڑے ؟"

سب سنجیدگی سے سوچنے لگے۔ پھر اظہر بولا۔

"اس نے نو لیمو توڑے تھے ــــ"

"کیسے ؟" شعیب نے لب دبا کے کہا۔

"نہیں بیس ــــ" زیب نے اپنا خیال بتایا۔

"نہیں نہیں ــــ چوبیس ــــ" اظہر پھر چیخ پڑا

"ابے خاموش رہو اُلّو ــــ" خالد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

چند لمحے خاموشی رہی ــــ پھر شہنا آہستہ سے بولی :

"اس نے صرف دو ہی لیمو توڑے تھے ۔"

"آپ کو پہلے سے معلوم تھا ۔" شعیب نے غیر یقینی سے اُسے دیکھا۔

"اب آپ کچھ بھی کہیں ــــ" زیب فخریہ لہجے میں بولی ۔" وہ امتحان میں تو پوری اتری ۔"

"اچھا تو اب دیکھتے ہیں ۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا ۔" تین جوڑے دریا پار کرنا چاہتے ہیں ۔ بادشاہ ملکہ ــــ وزیر اس کی بیوی ــــ اور سپاہی اور بیوی ــــ کشتی ایک ہے جو صرف دو کا وزن سہار سکتی ہے ۔ بیویاں تینوں کی خوبصورت ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ ایک کی بیوی دوسرے کے پاس تنہا رہے ۔ دوسری بات یہ کہ کوئی عورت کنارے پہ تنہا نہیں رہ سکتی ۔ اب بتائیے کہ دریا کیسے پار کیا جا سکتا ہے ؟"

"اس میں تو کوئی مشکل نہیں ۔" اظہر نے جلدی سے کہا ۔" باری باری چلے جائیں ــــ پہلے بادشاہ اور ملکہ ، پھر وزیر اور اس کی بیگم پھر ــــ"

"کشتی واپس لے کے آپ آئیں گے ۔" زیب نے اُسے گھورتے ہوئے کہا ۔ سب ہنس پڑے ــــ اور اظہر بڑی لاپروائی سے چیونگم کا پیکٹ کھولنے لگا ۔

"ایسا ہوگا ــــ" زیب نے سنبھل کے کہا :" سب سے پہلے بادشاہ اور ملکہ جائیں گے ۔ پھر بادشاہ کشتی لے کے واپس آ جائے گا ۔"

"لیجیے بسم اللہ ہی غلط ــــ" وحید نے ہنس کر کہا ۔

"تو چلیے بادشاہ نہیں ملکہ آگئی"۔ وہ جلدی سے بولی۔

"اچھا چلیے"۔ شعیب نے کہا۔

"چلیے ـــــ" اظہر نے کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ گیا ـــــ "مگر کہاں؟"

"زیادہ بنا نہ کریں ـــــ" زیب نے منہ بنا کے کہا۔

"تو کیا بننا اور اترانا صرف لڑکیوں کے حصّے میں ہے؟" اظہر نے اُسے جلانے کو کہا۔

"چھوڑو بھئی، میں بتاتا ہوں"۔ خالد کی آواز پر سب اُس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"بھیّا، اس بے چاری کو ارمان تو نکالنے دیتے"۔ اظہر نے شرارت سے زیب کی طرف دیکھا۔

"نہیں، اب وہ نہیں بتائے گی"۔

"اگر ذہین ہو تو......."

"ہاں جاؤ، بس نہیں ہے ـــــ آپ کو کیا"۔ زیب نے غصّے سے کہا اور اظہر سہم کے خالد کے پیچھے ہوگیا۔

"سب سے پہلے بادشاہ اور ملکہ جائیں گے"۔ خالد نے کہا۔ "پھر ملکہ واپس آکے وزیر کی بیگم کو لے جائے گی اور وہاں وزیر کی بیگم کو چھوڑ کے ـــــ"

"یاد رہے کہ وزیر کی بیگم حسین عورت ہے اور بادشاہ ......" وحید نے ہنس کے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہاں ۔" خالد ماتھے پر ہاتھ رکھ کے بولا ۔" وزیر کی بیگم اور ملکہ وہاں رہ جائیں گی ـــــ اور بادشاہ واپس آ کر وزیر کو لے جائے گا ـــــ وزیر کو وہاں چھوڑ کے ملکہ کشتی لے آئے گی اور سپاہی کی بیوی کو لے جائے گی، پھر خود ادھر رہ جائے گی اور سپاہی کی بیوی جا کر سپاہی کو لے آئے گی ۔"

سب نے تالیاں بجائیں اور شعیب دوسری پہیلی بیان کرنے لگا :

" ایک آدمی پانوں کی ٹوکری، بکری اور شیر کے ساتھ دریا پار کرنا چاہتا ہے ـــــ لیکن ایک بار میں وہ صرف ایک چیز لے جا سکتا ہے ۔ مگر اس طرح کہ بکری پان نہ کھا جائے اور شیر بکری ۔"

" سب سے پہلے وہ شیر کو لے جائے ۔" اظہر نے مسکرا کے کہا ۔ پھر خود ہی بولا ۔" ابے نہیں ـــــ ورنہ بکری پان کھا جائے گی ـــــ ۔" " میں بتاتی ہوں ۔" زیب جلدی سے بولی ۔" پہلے وہ پانوں کی ٹوکری لے جائے ۔"

" لیکن یاد رہے کہ شیر بھی بکری کو کھا سکتا ہے ۔" اظہر نے ہنس کے کہا اور زیب خاموش ہو گئی ۔

" آپ بتائیں سارہ ۔" خالد نے کہا ۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی :

" سب سے پہلے اسے بکری کو لے جانا چاہیے ۔ پھر بکری کو اس طرف چھوڑ کے وہ پانوں کی ٹوکری لے جائے ـــــ" بات ادھوری چھوڑ کے وہ پھر سوچنے لگی ۔

"ہاں ہاں، بولیے نا ــــ رُک کیوں گئیں"۔ اظہر نے مضحکہ اُڑایا۔
زیب نے اُسے گھُور کے دیکھا اور شہنا پھر بول پڑی۔
"پانوں کی ٹوکری کنارے پر چھوڑ کے وہ بکری کو اپنے ساتھ لے آتے۔ یہاں بکری کو چھوڑ کے شیر کو لے جائے ــــ اور پھر شیر کو ادھر چھوڑ کے آتے اور بکری کو لے جائے"۔
"واہ وا"۔ سب نے تالیاں بجائیں۔
اظہر منہ بنا کے بولا:
"ہمارے خالدی نے جو حل کی وہ اسی طرح کی پہیلی تھی۔ کوئی کمال نہیں کیا"۔
"نہیں یار"۔ شعیب نے ستائشی نظروں سے شہنا کو دیکھا۔ "اِسے بہت کم لوگوں نے حل کیا ہے"۔
"کوئی اور ــــ" زیب بڑے فخر سے بولی۔
"تم کیوں پھول رہی ہو"۔ اظہر ہنسا۔ "کسی ایک کا بھی جواب نہیں دے سکیں"۔
"اور تم کون سا دے رہے ہو؟" وہ منہ بنا کر بولی۔
"دونوں ہی اناڑی ہیں"۔ خالد ہنس پڑا اور زیب کے ساتھ اظہر بھی جھینپ گیا ــــ پھر اپنی جھینپ مٹانے کو بولا:
"چلو ایک کمال ہم بھی دکھائیں"۔
"کہاں چلیں ــــ؟" وحید نے اُسی کا جوتا اُس کے سر پہ دے مارا۔

"یہاں کو چلے آؤ میرے قریب ــــ" وہ شرمندہ ہونے کے بجائے بات بنا گیا۔

"ہاں دکھاؤ۔" وحید اُٹھ کے اُس کے پاس آگیا۔

"اپنے دل میں کتنے بھی روپے سوچ لو۔" اظہر نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوچ لیے ــــ" وہ سر ہلا کے بولا۔

"دس میرے ملا لو۔"

"ملا لیے۔"

"اب سارے روپے جمع کر کے آدھے خیرات کر دو۔"

وحید نے دل ہی دل میں حساب لگا کے کہا: "کر دیے۔"

"اچھا ــــ اب ڈھائی روپے کی مٹھائی منگوا کے بچوں میں تقسیم کر دیں۔"

کر دی۔" وحید نے مسکرا کے کہا۔

"باقی بچے ڈھائی روپے ــــ اس کی مٹھائی اور منگوا لیں، ہم سب کھائیں گے۔"

"مان گئے یار ــــ" وحید ہنس کے بولا۔

"کیا واقعی؟" زیب نے غیر یقینی سے کہا۔

"ہاں، بالکل صحیح تھا۔" وحید نے بتایا۔

"اچھا آپ نے کتنے روپے سوچے تھے؟"

"دس"

"اور دس ہی آپ نے شعیب بھائی کے سوچے تھے" وہ خود ہی بولی۔

"اور دس ہی اجی کے"

"جی ہاں" وحید نے سر ہلایا۔

"پھر آدھے خیرات کیے ــــ یعنی پندرہ ــــ پھر شعیب بھائی کے انہیں واپس دے دیے ــــ" اظہر نے کہا۔ "ڈھائی روپے کی بچوں میں مٹھائی بانٹی ــــ اور ڈھائی روپے کی ــــ آپ نے منگوائی نہیں وحید بھائی ــــ" اظہر نے اُچھل کے کہا۔

"آپ نے مجھے دس روپے دیے ہی نہیں تھے؛ ورنہ ــــ" وحید نے مسکرا کے کہا۔ "ڈھائی چھوڑ پانچ روپے کی منگواتا ــــ لیکن ڈاڑھیں اس سے بھی ہماری گیلی نہ ہوتیں" شعیب ہنس کے بولا۔

"اچھا، اب میں سوچتی ہوں" زیب بولی۔

"اچھا" اظہر سنبھل کے بیٹھ گیا۔ "سوچو"

"سوچ لیے"

"دس میرے ملا لو ــــ اور دو خالدی کے"

"ملا لیے ــــ"

"سب جمع کر لو"

"کر لیے"

"سب سے پہلے خیرات نکالو۔"

"کتنی نکالوں؟"

"آدھی نکالنا چاہیے۔"

"نکال دی۔"

"اب جتنے روپے تم نے سوچے تھے، آدھوں کی مجھے چنگم لادو۔"

زیب زور سے ہنس پڑی: "اتنے میں آئے گی ہی نہیں۔"

"تو لاؤ مجھے دے دو، میں اپنے پاس سے اور ملا کے لے آؤں گا۔" اظہر نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا اور زیب نے خالد سے چھ پیسے لے کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

"اب پانچ روپے ملکہ کے منّے کو دے دو۔"

"دے دیے۔" اُس نے مسکرا کے کہا۔

"باقی تمہارے پاس ایک روپیہ بچا۔" اظہر نے بڑی شان سے کہا۔

"ہاں واقعی ——" زیب آخر اسے مان ہی گئی۔

"اور یہ بھی بتا دوں کہ تم نے اپنے دو آنے سوچے تھے۔"

"ہاں ——" زیب کی پلکیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ارے بیوقوف تم نے چھ پیسے اسے دے کر خود ہی تو ظاہر کر دیا۔" خالد ہنس کے بولا۔

اور وہ جھینپ گئی پھر چونک کے بولی: "اچھا، اجی اب ہمیں بتاؤ کیسے پتا چلتا ہے۔"

"نہیں، یہ راز ہم نہیں بتا سکتے۔" وہ اِترا کے بولا۔

زیب اُسے گھورنے لگی ــــ اور اس نے خواہ مخواہ شہنا کو چنگم کی دعوت دے ڈالی۔

"جی، میں چنگم نہیں کھاتی"۔ اس نے مسکرا کے کہا۔

"اچھا جناب"، زیب اُٹھتے ہوئے بولی۔ "ہم پانی پی آئیں۔ پھر آپ سے سمجھیں گے"۔ اُس نے آنکھ سے شہنا کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔

"کیوں کیا پانی پی پی کے کوسنے کا ارادہ ہے"۔ شعیب نے ہنس کے کہا۔

"جی نہیں۔" وہ مُڑ کے بولی۔ "ہم بھی آپ کو ایک کمال دکھائیں گے"۔ اس نے کہا اور شہنا کے ساتھ باہر چلی گئی ــــ اور کچھ دیر بعد دونوں مسکراتی ہوئی اندر آئیں اور اپنی جگہ بیٹھ گئیں۔

"دیکھیے جناب"، زیب نے کہا۔ "شہنی ہم سے بہت دور بیٹھے گی ــــ آپ لوگوں کو کھانے میں جو چیز پسند ہو، میرے کان میں بتا دیجیے۔ میں مختلف چیزوں کے نام لے کے پکاروں گی، جو چیز آپ کو پسند ہو گی شہنا بتا دے گی"۔

"تو یہ آپ کا کمال کیسے ہوا محترمہ ــــ" اظہر ٹھوڑی پہ انگلی رکھ کے بولا۔

"چلیے شہنا نہیں، میں سہی۔" وہ جلدی سے بولی۔

"باس، باس۔" اظہر ہاتھ اٹھا کے بولا۔ "سمجھ گیا، پانی پینے کے بہانے تم تھوڑی سی عقل شہنا سے لے آئی ہو"۔

"آپ کو ضرورت ہو تو آپ بھی لے لیں"۔ زیب لب دبا کے بولی۔
"جی، اللہ کا فضل ہے"۔ وہ لاپروائی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔
"آپ اپنا کمال شروع کیجیے"۔ وحید نے بات ختم کرنے کو کہا۔
"سارا موڈ خراب کر دیا لے کے"۔ زیب کا منہ بن گیا۔
"بھلا وہ کیسے لے کے"۔ اظہر نے شرارت سے اس کی نقل اتاری۔
"نہیں، اظہر بھائی"۔ شعیب نے آنکھ سے اُسے اشارہ کیا۔"دوسروں کو بھی موقع دینا چاہیے ــــ"
"شروع کرو زیبو"۔ خالد نے کہا۔
"نہیں، بس ہم نہیں کرتے"۔ زیب کا منہ پھول گیا تھا۔
"کیا ــــ شادی؟" اظہر بہت گھبرا کے بولا۔
"اجّی ـ" وہ بہت زور سے چیخی اور اظہر سہم کے خالد کے پیچھے ہو گیا۔
"اس نمائش کا کیا ہوا وحید؟" خالد نے جان بُوجھ کے انجان بنتے ہوئے کہا۔
"میرا خیال ہے اگلے ماہ لگ رہی ہے"۔ وحید نے بتایا۔
"تمہارا ارادہ ہے کیا شریک ہونے کا؟" شعیب نے پوچھا۔
"ہاں خیال تو ہے"۔ خالد نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔
"اچھا زیب اب میں چلوں گی"۔ شہنا نے موقع پا کے زیب کا ہاتھ دبایا۔

"نہیں ابھی نہیں" زیب نے سارا غصہ وصہ بھول کے اس کا ہاتھ زور سے تھام لیا۔

"نہیں زیب، ممی پریشان ہو رہی ہوں گی تمہارے لیے۔"

"سمجھ رہی ہوں گی، مر گئی بے چاری جوان جہان" اظہر بیچ میں بول پڑا۔

"ہاں مر ہی جاؤں، اللہ کرے تم سے پیچھا تو چھوٹے" زیب کا موڈ پھر بگڑ گیا۔

"پھر بھی نہیں چھوٹے گا" اظہر نے کنکھیوں سے خالد کی طرف دیکھ کے آہستہ سے کہا۔ "تیرے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی حرام ہے زیبا بائی گاڈ میں بھی مر جاؤں گا"

"آؤ شہنو، میں تمہیں گیٹ تک چھوڑ آؤں" زیب نے اپنی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے سنجیدہ بن کے کہا۔

"تب خالد جو دوستوں سے باتوں میں مصروف تھا چونک کر بولا: کیوں ؟"

"ممی پریشان ہوں گی" وہ آہستہ سے بولی۔

"انہیں فون کر دیا ہوتا" خالد اُسے مزید روکنا چاہتا تھا۔

"ہاں شہنی، آنٹی کو فون کر دیتے ہیں"

"نہیں زیب، ویسے بھی خاصی دیر ہو گئی ہے"

"اچھا تو چلیے، میں آپ کو چھوڑ آؤں" خالد اپنے دوستوں سے انتظار

کا کہہ کے اُٹھ گیا ـــــ باہر لان میں بے بی چھوٹے کُتے ٹمی کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ شہنا کو دیکھ کے دوڑتی ہوئی آ گئی۔

"اِسے کیوں ساتھ لے کے آئی ہو؟" زیب نے شہنا سے پوچھا۔

"اس لیے کہ لوگ غلط نہ سمجھیں۔"

اظہر حسبِ عادت درمیان میں ٹپک پڑا۔ "اب کم سے کم والدین تو لگیں گے۔" اُس نے مسکرا کے کہا۔

"ایڈیٹ۔" زیب نے اُسے گھورا۔

لیکن شہنا بے بی سے یوں مخاطب تھی جیسے سُنا ہی نہ ہو۔

"آؤ بے بی ـــ جلدی کرو۔" اس نے بے بی کو اندر بٹھا کے پٹ بند کر لیا ـــ خالد نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

دونوں سہیلیوں نے ایک دوسرے کو ہاتھ ہلایا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

۷

بھیگی ہوئی اک شام کی دہلیز پہ بیٹھے
ہم دل کے سُلگنے کا سبب سوچ رہے ہیں

موسم بھیگ رہا تھا۔ مینہ خاصی دیر سے برس رہا تھا اور ایسے میں شہنا بڑے کمرے میں ہیٹر آن کیے کوچ میں دھنسی ہوئی تھی ـــــ قریبی ٹیبل پر رکھا ہوا ریکارڈ پلیئر چل رہا تھا اور وہ آنکھیں موندے گیت کے بولوں میں گم تھی۔ کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکرا کے گرنے والے بارش کے قطرے ایک پیاری سی موسیقی پیدا کر رہے تھے اور ایسی آواز کے ساتھ مل کے گانے والی کی کھوئی کھوئی سی آواز کمرے کی فضا کو ایک عجیب سا سوز بخش گئی تھی۔

"انکھیاں توری راہ نہاری او پردیسیا آجا ہو ـــــ" اور اسی لمحے گھنٹی کی تیز آواز نے چیخ کے جیسے کسی کی آمد کا اعلان کیا تھا ـــــ وہ بے ساختہ اٹھ کے دروازے کی طرف بڑھی اور پٹ کھول کے باہر نکل آئی۔ تیز ہوا کے نم جھونکوں نے اس کے رگ و پے میں سرد سی لہر دوڑا دی۔ لیکن جانے کس جذبے کے تحت وہ برآمدے سے اتر کے صحن کی سرد فضا میں اُتر آئی۔ مینہ اب بھی برس رہا تھا۔ وہ بھیگتی ہوئی گیٹ پر آئی اور پٹ کھول دیے لیکن وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔ وہ کھوئی کھوئی سی واپس لوٹ پڑی۔ تب دوبارہ ہونے والی بیل نے اُسے احساس دلایا کہ وہ کال بیل نہیں، ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز تھی۔ کمرے میں داخل ہو کے اس نے ریسیور اٹھا لیا لیکن اب فون بھی خاموش ہو چکا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کے ریسیور کریڈل پر رکھا اور ٹیبل کی طرف جھکتے ہوئے

ریکارڈ بدل دیا۔ آواز ابھری اور شہنا ایک بار پھر آنکھیں موند کے کوچ میں دھنس گئی۔ آواز کہہ رہی تھی:

ملتی ہے زندگی میں محبت کبھی کبھی

تب ٹیلی فون ایک بار پھر گنگنا اٹھا۔ اس نے چونک کے آنکھیں کھول دیں پھر ہاتھ بڑھا کے ریسیور اٹھا لیا۔ گیت کے بول ابھر رہے تھے۔

شرما کے منہ نہ پھیر نظر کے سوال پر
ملتی ہے دلبروں کی عنایت کبھی کبھی

دوسری طرف ایک گہرا سانس کھینچنے کی آواز محسوس ہوئی اور شہنا نے ماؤتھ پیس میں کہا:

"ہیلو"

"شہنا" دوسری طرف سے کوئی آہستہ سے بولا۔ اور اس کا دل بے ساختہ دھڑک اٹھا۔

"میں خالد ہوں" اس نے بتایا اور نہ بھی بتاتا تو کیا فرق پڑتا۔ شہنا تو اس کے مخصوص لہجے کو آواز سنتے ہی محسوس کر چکی تھی۔ اس نے مدھم آواز میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام" اس کی آواز مسکرائی۔

"موسم کی خوبصورتی سے فائدہ اٹھا رہی ہیں"

"جی بس ___ وہ" شہنا کو کچھ سوجھا نہیں، خاموش ہو گئی۔

اس طرف بھی خاموشی تھی اور اس چپ چاپ وقت میں گلوکارہ گیت کے آخری بول دہرا رہی تھی:

گم ہو نہ جائیں ہم کہیں دنیا کی بھیڑ میں
ملتی ہے پاس آنے کی مہلت کبھی کبھی
ہوتی ہے دلبروں کی عنایت کبھی کبھی

"زیب کو کل سے بخار تھا کچھ۔" خالد نے کہا۔ "میں نے سوچا آپ کو بتا دوں۔"

اس نے ایک لمحے کو سوچا، پھر ہنسی:

"کہیں آج پھر — تو —" اس نے بات ادھوری چھوڑ کے گزشتہ واقعہ کی طرف توجہ دلائی۔

"نہیں نہیں۔" وہ ہنس پڑا۔ "آپ کی قسم آج کوئی مبالغہ نہیں ہے اگر کہیں تو فون اٹھا کے زیب کے کمرے تک لے جاؤں۔"

"ہاں ہاں ضرور کروا دیجیے اس سے بھی بات۔"

"آپ یہ بتائیے کہ اس وقت کر کیا رہی تھیں؟"

"جی کچھ بھی نہیں، بس ایسے ہی۔"

"لیکن آپ جو کر رہی تھیں اُس کی آواز میں نے سُن لی تھی۔" اس کی آواز مسکرائی۔

وہ جھینپ گئی، کچھ نہیں بولی۔

"کوئی پیارا سا گیت ہمیں بھی سنا دیجیے۔" اس نے کہا۔

"چھوڑیے گیت تو آپ سُنتے ہی رہتے ہیں۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ چلیے پھر آپ ہی بولیے کچھ۔"

وہ جُز بُز سی ہو گئی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی:

"زیب سے بات نہیں کروا رہے آپ؟"

"اوہ، اچھا۔" وہ بھی سنبھل گیا۔ پھر کچھ دیر بعد اسے زیب کی آواز سنائی دی۔ اسے واقعی بخار تھا آواز سے نقاہت ظاہر تھی۔

"شاید اللہ میاں نے جھوٹ کی سزا دی ہے۔" زیب نے ہنس کے کہا۔ "کل رات ہی بخار ہو گیا تھا۔" پھر وہ دونوں کتنی ہی دیر باتیں کرتی رہیں۔ شہنا نے کہا۔

"موسم کتنا حسین ہو رہا ہے۔ میں تو کمرہ بند کیے ریکارڈ سن رہی تھی۔ سوچا بارش میں باہر تو نکل نہیں سکتے۔ بند کمرے میں ہی لطف اٹھا لیں۔"

"کوئی پیارا سا گیت مجھے بھی سنا دو ڈیئر۔" زیب نے کہا اور وہ مسکرا دی۔ کچھ دیر پہلے کی گئی خالد کی فرمائش یاد آ گئی تھی۔

"لو تو پھر سنو۔" اس نے ایک نیا ریکارڈ لگا کے رسیور ٹیبل پر رکھ دیا اور ریکارڈ چلتا رہا۔

میرے ساتھی یونہی مجھ پہ تم نظرِ عنایت کرتے رہو
میں تم سے محبّت کرتی ہوں تم مجھ سے محبت کرتے رہو
اے کاش کہ ایسا ہو جائے چاہت میں اک ایسا موڑ آئے
میں پاس تمہارے بیٹھی رہوں اور دل کی بات آنکھوں سے کہوں
تم پوچھو مجھ سے چپ ہو کیوں لیکن میں کچھ بھی کہہ نہ سکوں
میرے ہمدم چپ رہنے کی تم مجھ سے شکایت کرتے رہو

گیت ختم ہوا تو اس نے رسیور ہاتھ میں اٹھا لیا، ہنس کے بولی:

"امید ہے گیت پسند آیا ہوگا۔ ابھی تمہارے بھیا بھی گیت سُننے کی فرمائش کر رہے تھے انہیں مت بتانا"۔

"کیوں کیا اس کے بھیا سے کوئی دشمنی ہے آپ کی ؟" خالد کی گھمبیر آواز پر اس کا دل یک لخت جیسے رُک گیا۔

"اوہ، تو کیا وہ سُن رہا تھا" اس نے شرم سے سوچا اور بالکل چپ سی رہ گئی۔

"سوری" خالد نے کہا اور رسیور یقیناً زیب کو دے دیا تھا کیونکہ اب وہ بول رہی تھی۔

"شہنا ڈارلنگ، فرمائش تو یہ بھیا کی ہی تھی، ہاں سفارش میں نے ضرور کی تھی۔ جانے کون سا گیت تھا انہیں بہت پسند آیا ہے"۔

"زیبو کی بچی بدتمیز، تو نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ کتنی بری بات ہے۔ میں نے ایسا بکواس سا گانا لگا دیا" وہ شرم سے سرخ ہو رہی تھی۔

"اچھا" زیب ہنسی۔ "مگر بھیا تو بڑے متاثر نظر آ رہے ہیں۔ بتاؤ تو کیا گیت تھا ؟"

"چھوڑ" وہ بتانا نہیں چاہ رہی تھی۔ بات بدلنے کو بولی۔ "تُو سنا اظہر بھیا کا کیا حال ہے ؟"

"وہ تو کل شام ہی پنڈی چلے گئے تھے" زیب نے بتایا۔

"اچھا تو اب سمجھی" شہنا شرارت سے بولی۔ "بخار اسی لیے چڑھایا ہوا ہے"۔

"ایڈیٹ" زیب نے گھر کا۔

"ویسے ان کا پنڈی میں دل تو نہیں لگے گا" شہنا ہنسی۔ "چند دن بعد ہی

پھر دوڑے چلے آئیں گے۔"

زیب کچھ نہیں بولی، ہنس دی۔

"اچھا یہ بتا" شہنا نے کہا۔ "یہ ایک دم بخار صاحب کیسے تشریف لے آئے؟"

"وہ بات دراصل یہ ہوئی" وہ بڑے مزے لے کے بتانے لگی۔ "کل شام جانے مجھے کیا سوجھی کہ دل چاہنے لگا۔ ایسی موسلا دھار بارش میں آئس کریم کھائی جائے۔ بھیّا نے بہت منع کیا مگر جب اظہر بھی میرا ساتھ دینے لگا تو بھیّا کو ہارنا پڑا اور ہم تینوں گاڑی میں بیٹھ کے نکل گئے۔"

"اور مجھے پوچھا بھی نہیں" شہنا نے ناراض ہونے کی کوشش کی۔

"ہائے جان، شکر کر کہ تو بچ گئی۔ اجّی تو کہہ رہا تھا مگر بھیّا نے منع کردیا کہ تیری امّی دیوانے سمجھیں گی ہم لوگوں کو ——"

"ویسے مزا تو بہت آیا ہوگا"

"ہاں بہت، اور اس وقت بھی خوب آرہا ہے" زیب نے رونی آواز بنا کے کہا۔

"ہاں ہاں، اس وقت تو واقعی آرہا ہوگا" شہنا ہنسی۔

"تو بھی کہہ رہی ہوگی شہنی کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی مگر قسم سے سارا درد ورد رفوچکر ہوگیا تیرے ساتھ باتیں کر کے؛ ورنہ ابھی ہائے ہائے کر کے بھیّا کا سر کھا رکھا تھا"

"چل، جیسے میں تو بڑی معروف شخصیت ہوں نا"

"تو پھر اس پیارے سے موسم میں کوئی حسین سا گیت تو سنا دے اپنی آواز میں"

" ہاں "۔ شہنا نے روٹھ کے کہا۔" اور تو پھر رسیور اٹھا کے اپنے بھیا کو دیدے۔"

" نہیں، بائی گاڈ۔ وہ تو چلے بھی گئے اپنے کمرے میں ـــ" اور شہنا کے تصور میں خالدہ کے کمرے کی تپائی پر رکھا ہوا سرخ رنگ کا چھوٹا سا ٹیلی فون ابھر آیا جس کا ایکسٹینشن ایک ڈرائنگ روم میں اور دوسرا برآمدے میں تھا اور جو اس وقت زیب کے کمرے میں تھا۔ اس نے لائن پر اس کی سانس کو محسوس کیا اور پھر اپنی پرسوز آواز اور مدھم سے لہجے میں وہ غزل شروع کر دی۔

نہ جانے کیوں میرا دل اس قدر مغموم رہتا ہے
سکوں نا آشنا ہے روح کیوں خوشیوں سے بیگانہ
ذرا سی ٹھیس لگتی ہے چھلک جاتا ہے پیمانہ
بہاروں سے چمن کیوں زیست کا محروم رہتا ہے
سناتی ہے مجھے افسانۂ غم شب کی خاموشی
سرا ملتا نہیں لیکن مجھے بھولی کہانی کا
ہوا کی سسکیاں ماتم ہے مرگِ ناگہانی کا
یہ کس منزل پہ لے آئی ہے مجھ کو خود فراموشی
لیے پھرتی ہے ویرانوں میں کس کی جستجو مجھ کو
کہ کس کی یاد کے نشتر مجھے پہروں رلاتے ہیں
کہ دھندلکوں میں یہ کس دنیا کے منظر جھلملاتے ہیں
یہ کس کا غم ہے سینے میں، ہے کس کی آرزو مجھ کو
نہ جانے کیوں میرا دل اس قدر مغموم رہتا ہے

"مجھے بتا دو۔" زیب شرارت سے بولی۔ "کسی کو نہیں بتاؤں گی۔" تنہا سہیلی کی آواز سن رہی تھی لیکن کسی کے دل سے نکلا ہوا ایک سرد سانس اس کے احساس پر بول اٹھا تھا۔

"میں خود نہیں جانتی۔" وہ آہستہ سے بولی۔ پھر ہنس دی۔ "تم پگلی ہو۔ بھلا یہ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو، اس نظم کے خالق سے پوچھو نا جا کے۔"

"اچھا تو پھر اجازت میں جاتی ہوں۔" زیب نے کہا۔

"خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" اس نے کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

ایک لفظ جو نکلا تھا صفیں دل کی اُلٹ کے

مُدّت سے میرے لب پہ وہ بے ہوش پڑا ہے

ریاض احمد غوری ایک آفس میں ہیڈ کلرک تھے۔ ایماندار اور شریف آدمی تھے، اس لیے کبھی محنت سے زیادہ حاصل کرنے کا نہ سوچا، پھر خاندان میں کوئی بڑا نہ تھا۔ کئی اولادوں میں صرف شہنا ہی زندہ بچی تھی اس لیے ماں اور باپ دونوں کی لاڈلی تھی۔ بس خوشحالی سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ وہ اب بھی ووڈ سٹریٹ کے ایک دو منزلہ مکان میں رہ رہے تھے جس کے برابر کبھی سیٹھ اسمٰعیل وصی بھی رہا کرتے تھے ___ سیٹھ صاحب بھی انہیں کی برانچ میں تھے مگر اوپر کی آمدنی پیدا کرنے میں کمال حاصل تھا۔ یہ بات الگ تھی کہ اس مہنگائی کے دور میں ایک بیوی اور تین چار بچوں کے ساتھ ان کی مے نوشی بھی برابر کی شریک تھی ___ اور یوں وہ کچھ رقم پس انداز نہ کر سکتے تھے۔ اس کے برعکس ریاض احمد غوری کو ہمیشہ اپنی بیٹی کا مستقبل پیش نظر رہا۔ دونوں میاں بیوی کچھ نہ کچھ رقم کفایت شعاری سے کام لے کر شہنا کے اکاؤنٹ میں جمع کرواتے رہے اور یہی وجہ تھی کہ آج وہ ریٹائر ہونے کے باوجود خالی ہاتھ نہیں تھے۔ ایک بڑی کپڑے کی دکان میں حصہ دار تھے۔ پھر چھوٹی موٹی جائیداد بھی تھی۔ وہاں سے بھی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔

اسمٰعیل وصی کی بیوی مہرنگار ایک نیک خاتون تھیں۔ ہمیشہ شوہر کی روش سے چلتی رہیں۔ دو بیٹیوں کے مستقبل کا خیال انہیں اندر ہی اندر چاٹ رہا تھا۔ ثمر نگار جوان تھی۔ ان کی ظاہری حالت دیکھ کے اچھے گھرانوں سے رشتے آتے تھے۔ مگر وہ جانتی تھیں، بیٹی کے ساتھ انہیں ایک اور رشتے کو بھی بیاہنا ہے اور جس کے لیے ایک بڑی رقم کا ہونا ضروری ہے، جہیز کا زہریلا خیال انہیں رہ رہ کے ڈستا تھا ——— اور پھر اچانک اسمٰعیل وصی نے بیٹی کا رشتہ ایک اونچی جگہ طے کر دیا۔ بیاہ ہوا اور اس شان سے کہ دیکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے ——— لیکن اسمٰعیل وصی قرض کی دلدل میں گلے گلے تک پھنس گئے۔ مستقبل کا تو انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ دوسرے دونوں بچے ابھی چھوٹے تھے ——— اچانک وقت آیا تو لینے کے دینے پڑ گئے ——— عیش کرتے ہوئے عمر کا وہ دور آ چکا تھا، جب کسی کام کے لیے نا اہل قرار دیا جاتا ہے ——— وہ ریٹائر ہوئے ——— تو فاقوں کی نوبت آ گئی ——— مہرنگار جیسی نیک خاتون بھی ہار گئیں، ضبط کی تاب نہ لا سکیں اور خاموشی سے دنیا چھوڑ گئیں۔ محبوب بیوی کے یوں اچانک چلے جانے پر اسمٰعیل وصی چونکے۔ ہوش آیا تو کشتی ڈوب رہی تھی تب وہ اسے بچانے کے لیے نبرد آزما ہو گئے۔ اپنا مکان فروخت کر ڈالا اور کرائے کے مکان میں اُٹھ آئے۔ ایک کثیر رقم بزنس میں لگائی اور خدا نے دیکھتے ہی دیکھتے حالات بدل ڈالے۔ یہ مرنے والی کی دُعاؤں کا اثر تھا کہ بزنس میں خاطر خواہ فائدہ ہوا اور چند ہی برس کے عرصے میں

وہ فرش سے عرش تک جا پہنچے۔ کوٹھی، کار، مِل اور ایک بڑے بینک بیلنس کے مالک تھے اور یہاں ـــــ وہ پھر اپنی پرانی روش پر اُتر آئے ـــــ ہزاروں روپیہ شراب میں بہانے لگے۔ خدا ڈھیل دے رہا تھا کہ جتنا لٹاتے تھے اتنا ہی بڑھتا تھا ـــــ زیب اور خالد شاہانہ زندگی بسر کر رہے تھے ـــــ لیکن خصلت میں دونوں بچے ماں پر گئے تھے ـــــ پُرخلوص اور ملنسار خالد وصی بچپن سے فن کارانہ صلاحیت لے کر پیدا ہوا تھا۔ یہ بات الگ تھی کہ زندگی کے ہنگاموں میں ڈوب کے وہ اپنی اس صلاحیت کو بروئے کار نہیں لایا تھا۔ لاپروا آدمی تھا ـــــ بہن کے برعکس سادہ زندگی کا عادی تھا ـــــ حالانکہ یہ زندگی ہر طرح کے عیش و آرام سے بھرپور تھی ـــــ کسی بھی قسم کے غم سے ناآشنا ـــــ لیکن وہ ایک حساس طبیعت رکھتا تھا۔ باپ کی روش اور ماں کی موت نے اُس کے دل کو شدّت سے احساس بخشا تھا۔ اس لیے وہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بُری طرح محسوس کرتا تھا۔

شہنا اس کے بچپن کا خواب تھی، پھر ایک مثالی دوشیزہ ـــــ اس کے خیال نے خالد کے دل کو اپنے حصار میں قید کر رکھا تھا اور اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنّا شہنا کو حاصل کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہ رہی۔ یہ آرزو بظاہر لاحاصل نہ تھی ـــــ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں، شہنا کے خیال کے ساتھ اس کا دل ایک ٹیس سی محسوس کرتا ـــــ عجیب سا درد ـــــ اس کے معصوم چہرے پر روئی روئی سی آنکھیں دیکھ کے اُس

کا دل ڈوبنے لگتا، لیکن اگلے ہی لمحے ان گہری آنکھوں میں اپنے پیار کا احساس ہوتا۔ تب اپنا بے کار سا خیال اُسے دل سے الگ کر دینا پڑتا۔

اور خالد کے جذبات کی زبان سمجھ لینے کے بعد شہنا نے اُس کے متعلق بڑی سنجیدگی سے سوچا تھا۔ بارہا سوچا تھا اور ہر بار، اُسے دل کے بہت نزدیک محسوس کیا تھا —— مگر ایک بے نام سا خیال خود شہنا کو بھی عجیب سی بے بسی کا احساس دلاتا تھا۔ اُس میں اظہار کی جرأت نہ تھی۔ جذبے کو عام کر دینے کا حوصلہ نہ تھا اور وہ سوچتی تھی اُس کے گھر کے دروازے پر کس قدر مشتاق نگاہیں پیوستہ ہیں کئی جگہ اس کے والدین سنجیدگی سے غور کر رہے تھے —— اور فیصلہ آج کل ہی میں ہونے کے آثار تھے —— شہنا کے اپنے خاندان میں کئی گھرانے اُسے اپنے گھر بیاہنے کے خواہش مند تھے اور کتنے ہی نوجوان اس کے حسن و کردار کے دلدادہ تھے، لیکن ریاض احمد اور ان کی بیگم، بیٹی کو خاندان میں بیاہنے کے حق میں نہ تھے —— خاندان کے علاوہ بھی کئی دوسرے گھرانے اس کے متمنی تھے —— لوگوں کے ذہنوں پر شہنا کے حسن و کردار کے علاوہ یہ خیال بھی سوار تھا کہ ریاض احمد کے پاس جو کچھ بھی ہے، بیٹی کا ہے —— انہی خاندانوں میں فاروقی خاندان بھی تھا —— مسز فاروقی بیگم غوری کے قریبی جاننے والوں میں سے تھیں اور اپنے بیٹے کے لیے شہنا کے رشتے کی دل سے خواہش مند تھیں —— شہنا کی ممی ان کی پورے طور سے ہم خیال تھیں —— لیکن ریاض احمد اپنے

پارٹنر کے بھانجے کی طرف مائل تھے۔ اس کے علاوہ ان کے دوست کریم بیگ اور ان کی بیگم بھی شہناؔ کو بہو بنانا چاہتے تھے۔

وہ سارے حالات سے آگاہ تھی۔ اُس نے مسز فاروقی کے بیٹے ریحان احمد کو بھی دیکھا تھا — ریاض احمد کے پارٹنر کا بھانجا سلیم بھی اس کا دیکھا بھالا تھا اور کریم بیگ کے بیٹے آصف جمال سے بھی وہ واقف تھی — اپنے خاندان کے سب لڑکوں سے بے تکلف تھی۔ یہ بات الگ تھی کہ کبھی کسی کو حد سے بڑھنے کا موقع نہ دیا — ان سب نوجوانوں کے متعلق اُس نے اکثر سوچا تھا مگر بذاتِ خود کبھی کوئی دلچسپی محسوس نہ کی تھی — پھر خالد کا خیال بھی ان میں شامل ہوا تو اُس نے اسے سب سے جدا محسوس کیا — باری باری جب سب کے بعد خالد وھی خیالوں میں اُترا تو چہرہ ایک عجیب سی مُسکان سے سُلگ اُٹھا۔ کوئی لطیف سا جذبہ دل کے قریب سے پھوٹ کر رگوں میں سرایت کر گیا۔ جی چاہا اپنی بے نام سی سوچوں کو کوئی پیارا سا نام دے ڈالے — مگر پھر کسی خیال نے اُسے ہولے سے لرزا دیا — عورت کی مجبوریاں — اور مرد کی بیوفا طبیعت اُسے کپکپا گئی — خالد نے کبھی اُس سے کھُل کے بات نہیں کی تھی، پر نگاہوں سے اس سُلگتے جذبے کی آنچ کو چھپانا شہنا کے بس کی بات نہ تھی اور خالد اس آنچ کی تپش دل پر محسوس کرتا تھا۔ دھیمی دھیمی لذّت آمیز تپش — جو دل کو طمانیت کا ایک خوب صورت احساس بخشتی تھی۔

وہ تمام دن شہنا کو ایک عجیب سی سوگواری کا احساس رہا ___ اور جب بہت دن بعد اچانک اُس نے مسز فاروقی اور اُن کی بہو کو اپنے گھر دیکھا تو کسی خیال کے تحت اُس کا دل لرز اٹھا ___ اور شہنا کا یہ خدشہ درست ہی تھا۔ دونوں ساس بہو بیگم غوری سے جواب لینے آئی تھیں۔

"اگلے ماہ ریحان احمد کینیڈا جا رہے ہیں" مسز فاروقی نے کہا۔

"اور ہم سوچتے ہیں ___" اُن کی بہو صوفیہ رحمان بولیں۔ "اگر دُلہن کو بھی ساتھ ہی بھیج دیا جائے تو اچھا ہے ___"

"میں نے ہمیشہ مسز فاروقی سے یہی کہا ہے کہ غوری صاحب دوسری طرف متوجہ ہیں۔" مسز غوری نے کہا۔ "اور اس بات سے آپ لوگ بھی واقف ہیں کہ میں ریحان میاں کو کس قدر پسند کرتی ہوں۔"

"مجھے تعجب ہے تم شوہر کو سمجھا نہیں سکتیں۔ آخر میرے بیٹے میں کوئی برائی بھی ہو۔"

"خدا نہ کرے۔" بیگم غوری جلدی سے بولیں۔ "وہ دراصل اپنے دوستوں کی وجہ سے ردّو کد کر رہے ہیں؛ ورنہ ریحان میاں لاکھوں لڑکوں میں ایک ہیں ___ آپ فکر نہ کریں ___" وہ مسکرا کے بولیں۔ "میں انہیں تیار کر لوں گی۔"

مسز فاروقی مسرت سے کھل گئیں، ہنس کے بولیں: "نہ صرف تیار بلکہ تاریخ لے لو تو بہتر ہے ___ میں اسی ماہ بیاہ سے فارغ ہو جانا چاہتی ہوں ___"

"انشاء اللہ میں بات ضرور بنالوں گی" مسز غوری نے کہا۔
اور دونوں ساس بہو رخصت ہوئیں تو بہت خوش تھیں۔
اُسی رات بیگم غوری نے شوہر سے بات کی —— ریحان احمد کے باہر جانے کی خبر نے انہیں کچھ سنجیدہ کر لیا تھا۔ باہر جا کے لڑکوں کا مستقبل تابناک ہو جاتا ہے۔ یہ ریاض احمد کا خیال تھا، لڑکا ہر حال میں بہتر تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے کہا :
"آخری فیصلہ کرنے سے پہلے ہم اپنی بیٹی کی رائے کو سب سے بہتر گردانتے ہیں"
"آپ بھی درست کہتے ہیں" مسز غوری نے کہا۔ "میں ابھی شہنو سے بات کیے لیتی ہوں"
وہ شوہر کے کمرے سے نکل کے بیٹی کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ شہنو کسی رسالے کے مطالعے میں مصروف تھی۔ ماں کو دیکھ کے اُٹھ بیٹھی۔
"لیٹی رہو" انہوں نے پیار سے کہا —— اور خود بھی اُس کے برابر بیٹھ گئیں۔
شہنا نے رسالہ ہاتھ سے رکھ دیا اور سنبھل کے بیٹھ گئی۔ "کہیے ممی، کوئی خاص بات ——" اس نے مسکرا کے کہا، اور بیگم غوری نے بڑی وضاحت سے اپنا عندیہ بیٹی پہ ظاہر کر دیا۔
شہنا چند لمحوں کے لیے گم سی رہ گئی پھر آہستہ سے بولی : "میں

ابھی شادی نہیں کروں گی ممی ۔"

"اچھے لڑکوں کی کمی ہے بٹیا ۔" بیگم غوری نے اُسے سمجھایا۔ "من پسند گھرانا بڑی مشکل سے ملتا ہے ـــــ مسز فاروقی بہت اچھی خاتون ہیں اور ریحان احمد ایک ہونہار اور قابل نوجوان ـــــ ان کے گھرانے کے عادات و اطوار بھی اعلیٰ ہیں۔ پھر ریحان احمد باہر جا رہا ہے۔ بٹیا، سنجیدگی سے غور کرو۔ ایک نہ ایک دن تو تمہیں بیاہ کرنا ہی ہے، پھر اچھے رشتے کو کیوں ٹھکراؤ ۔" انہوں نے پیار سے کہا اور وہ ماں سے لپٹ کر سسک اُٹھی ۔

"نہیں پیاری ممی، ابھی مجھے مجبور نہ کرو ـــــ میں ـــــ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی ۔"

لیکن جب یہی استفسار باپ کی طرف سے ہوا ـــــ تو شہنا کے جیسے لب سِل گئے۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی ۔ انہوں نے محبّت سے سمجھایا۔

"اولاد کا گھر بسانا والدین کا فرض ہوتا ہے اور جب تک اس فرض سے سبکدوش نہ ہوا جائے، سکون اُن کے لیے حرام ہوتا ہے اور بٹیا ہم تم سے درخواست کرتے ہیں کہ تم ہمیں سکون دے دو ـــــ ہاں سوچ سمجھ کے جواب دو کہ مسز فاروقی کا گھرانا اور ان کا بٹیا تمہیں پسند ہے یا نہیں ؟" اور تب اس نے اپنی ماں سے کہا تھا :

"ممی میں کچھ دن بعد سوچ کے آپ کو جواب دوں گی ۔" بیگم غوری خاموش ہوگئیں کہ وہ کسی طرح اس معاملے پر سنجیدہ تو ہوئی ـــــ اور شہنا کا

دل جیسے بول رہا تھا کہ خالدی کا جذبہ بے لوث ہے ___ مگر کسی بھی قسم کا اپنی طرف سے اظہار وہ نسوانیت کی موت تصور کرتی تھی ___ اس نے بہت کوشش کی کہ خالد وصی کو ذہن سے نکال کے ریحان احمد کا تصور بھرلے۔ اُس نے ریحان احمد سے متعلق بڑی شدت سے غور کیا ___ وہ جو ایک اعلیٰ آفیسر اور خوبصورت شخصیت کا مالک ایک با اخلاق شخص تھا بہت سوچنے پر بھی وہ اس سے متعلق کوئی بُرائی ذہن میں نہ لا سکی۔ لیکن اس کے باوجود اس کا دِل خالد وصی پر اس شخص کو ترجیح نہ دے سکا۔

تب اس نے سوچا، خالد کا امتحان بھی لے ڈالے۔ ہو سکتا ہے عام عاشقوں کی طرح وہ محض ٹھنڈی آہ بھر کے رہ جائے جب اُسے معلوم ہو کہ وہ پرائی ہو رہی ہے ___ یا وہ خاموش رہے ___ اس شخصیت کو راز ہی رہنے دے جیسے کہ اس نے کبھی ظاہر نہیں کیا اور یوں بات ختم ہو جائے ___ ہر چند کہ اس کا جی کہتا تھا خالد تڑپ اُٹھے گا، بے قرار ہو جائے گا ___ لیکن پھر بھی نادان دل کے کہنے پر وہ کوئی امید نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ مبادا خود اپنے ہی من میں اپنی توہین کا احساس اُسے مار ڈالے۔ اُس نے سادہ سا لباس زیب تن کیا اور ماں سے کہہ کے الوصی جانے کے لیے نکل گئی ___ اور ان لمحات میں جب وہ صرف اسی کے متعلق سوچ رہی تھی ___ اس کی سیاہ امپالا اس کے قریب آ رُکی۔ آسمانی رنگ کے ہائی ینگ ہوسٹر میں وہ خاصا حسین لگ رہا تھا۔ چشمے کے ہلکے شیشوں سے جھانکتی ہوئی گہری آنکھوں کی تپش شہنا کو دل پر محسوس ہوئی۔

دل دھڑک اٹھا ـــــ بوکھلا کے جلدی سے سلام کر ڈالا۔

"کہاں جا رہی ہو ؟" اُس نے ہنس کے پوچھا۔

"یہیں اپنی ایک دوست کے" وہ ہولے سے بولی ـــــ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کی ہمراہی میں کسی راہ جا کے بات بننے کا موقع پیدا کرے۔

"میں چھوڑ دوں ـــــ" وہ حسبِ توقع مسکرا کے بولا۔

"جی نہیں ـــــ ہم خود ہی چلے جائیں گے۔ یہاں سے بہت قریب ہے" وہ جلدی سے بولی۔

"ہماری طرف کئی دن سے نہیں آئیں" وہ خاصا سنجیدہ تھا۔

"دوست کے گھر ہو کے پھر آپ کی طرف بھی آئیں گے"

"ضرور" خالد نے گہری نظر سے دیکھا۔

"جی" اس نے نظر جھکالی۔

امپالا ایک جھٹکا لے کے آگے بڑھ گئی ـــــ تو وہ دُور تک چمکیلی سڑک پر اُسے جاتا دیکھتی رہی ـــــ پھر ایک گہرا سانس لے کے بس سٹینڈ کی طرف بڑھ گئی۔

۹

بُجھ رہے ہیں چراغ دیر و حرم

دل جلاؤ کہ روشنی کم ہے

وہ خاصی دیر سے دریچے میں جھکا کھڑا تھا ـــــ زیب نے بھائی کو بے قرار سا دیکھا تو بے اختیار سوچنے لگی ـــــ "یہ میرے بھیّا کبھی اس قدر بے تاب کیوں ہو جاتے ہیں، جیسے کہ کوئی غم ـــــ" اور خود ہی اپنی یہ سوچ جھٹک دی ـــــ خود بھی بے تاب سی ہو کے برآمدے میں آ کھڑی ہوئی اور تب ہی لان کراس کرتی ہوئی ـــــ شہنا کو دیکھ کے وہ اپنی اُداسی بھلا بیٹھی جو بھائی کی بے قراری نے اس کے ذہن پر مسلط کی تھی ـــــ دوڑ کے سارہ سے لپٹ گئی۔

"قسم سے سارہ ـــــ آج ہی بھیّا اور میں تجھے یاد کر رہے تھے" اس نے زور سے کہا۔ "اور بھیّا نے تو یہاں تک کہا تھا کہ میرا نجوم کہتا ہے، آج شہنا ضرور آئے گی"

پھیکی سی مُسکان اُس کے لبوں پہ آگئی۔

"لیکن میرا دل گواہی دے رہا ہے ـــــ تو اداس ہے شہنا ـــــ" زیب اُس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔ "میں تو تجھے ایک خوشخبری دینے آئی تھی"

"کیا ——؟" زیب چلتے چلتے اس کے سامنے رُک کے کھڑی ہو گئی۔ "جلدی بولو"

"ممی نے میری بات طے کر دی ہے۔" وہ ہولے سے بولی —— اور زیب نے ایک بار پھر اُسے لپٹا لیا۔

"کون خوش نصیب ہے وہ ——" اُس نے شوخی سے کہا۔ یہ بھی بھول گئی کہ کچھ دیر پہلے اُس کے اُداس ہونے کی گواہی دے رہی تھی —— اور اوپر کی سیڑھیوں سے اُتر کے خالد اُن کے قریب چلا آیا —— شہنا نے نظر اُٹھا کے اُسے دیکھا۔ ہلکے زرد ٹیٹرون کی شلوار اور قمیص اس کے جسم پر بہت خوب صورت لگ رہی تھی —— اس کی سیاہ آنکھوں میں روشنی اور لبوں پہ مُسکان تھی۔

"سارہ کی منگنی طے پا رہی ہے بھیا۔" زیب نے بڑی خوشی سے اُسے اطلاع دی تھی —— اور روشن آنکھیں بُجھ گئیں، لب ساکت رہ گئے —— زیب نے غور سے بھائی کے چہرے کو دیکھا —— اور یہی وہ لمحہ تھا جب سارہ کی افسردگی اُسے کسی بڑے راز سے آگاہ کر گئی۔

"کیا یہ صحیح خبر ہے سارہ" خالد نے شہنا کے چہرے پہ نظر جما کے آہستہ لہجے میں کہا مگر آہستگی کے باوجود اُس کے اندر کا کرب پھر بھی پوشیدہ نہ رہ سکا۔

"کیا آپ اُسے دُکھ بخش کے خوش رہ سکیں گی شہنا؟"

شہنا نے سر جھکا لیا —— ہولے سے بولی۔

"مشرقی عورت کسی کو خوشیاں دینے یا دُکھ بخشنے کی مجاز نہیں۔"

"کیا یہ بات طے ہونے سے پہلے ختم نہیں ہو سکتی ؟" اس کے لہجے میں اضطراب تھا۔

شہنا نے کچھ نہیں کہا — ایک گہری نظر اس کی طرف ڈال کے سامنے گھاس کاٹتے ہوئے مالی کو دیکھنے لگی۔

"مجھے افسوس ہے شہنا" خالد نے پھر کہا۔ "وہ چاہتا تھا کہ قدم بڑھائے — مگر تم نے اُسے موقع ہی نہیں دیا۔"

"کون ؟" زیب نے چونک کے بھائی کی طرف دیکھا — لیکن جواب میں وہ دونوں خاموش تھے۔

"سارہ مجھے جواب دو — کیا اس کے لیے ابھی موقع ہے ؟" خالد نے کہا۔

سارہ نے بہت اداسی سے اس کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"اگر سارہ اپنی زندگی کے اس فیصلے پر اداس ہے بھیا" زیب نے گہرے لہجے میں کہا۔ "تو میں آنٹی سے مل کے اس بات کو ختم کروانے کی کوشش کروں گی"

"یہ اپنے بھیا پہ تمہارا احسان عظیم ہوگا زیبو" وہ ہولے سے بولا — اور زیب بہت کچھ سمجھ گئی — سارہ بدستور مالی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"ابو سے کہیں گے چچا غوری سے بات کریں —" زیب نے سارہ کی طرف دیکھ کے کہا۔

"میں تھک گئی ہوں۔" سارہ نے ہولے سے کہا۔ "کیا اندر نہیں چلو گی؟"

"ہائے اللہ۔" زیب ہنس دی۔ "تھک گئیں شہزادی جی— آؤ جی چلیں اندر۔"

"ہاں، تم لوگ چلو۔" خالد نے اس کی جانب پیار سے دیکھ کے کہا۔ "میں ذرا ایک جگہ فون کر کے کچھ آرڈر دے دوں۔"

سارہ کا چہرہ جس کی پشت اُن کی جانب تھی دلی مسرت سے روشن ہو گیا— دل جیت گیا تھا۔

زیب نے آگے بڑھ کے اُس کا ہاتھ تھام لیا تھا— اور دونوں اندر کی جانب چلی گئیں—

اُسی شام زیب نے ایک بہترین لباس زیب تن کیا۔ زیوروں کا ہلکا سا سیٹ بھی پہنا اور اپنے باپ کی قیمتی گاڑی میں غوری لاج کو چل دی— بیگم غوری نے اس کا استقبال بہت جوش سے کیا اور ایسا وہ ہمیشہ کرتی تھیں— سیٹھ وصی کی امارت سے خاصی مرعوب تھیں۔ اس لیے چاہتی تھیں، بڑے باپ کی بیٹی کے سامنے ان کی سارہ کو کسی قسم کا احساس کمتری نہ ہو۔ وہ اُس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتیں لیکن زیب درحقیقت مخلص لڑکی تھی اور سارہ سے دلی محبت رکھتی تھی۔ اب جب کہ بھائی کا پیار بھی اس محبت میں شامل ہوا تھا وہ اُسے کچھ زیادہ ہی عزیز ہو گئی تھی، پوری کوشش میں تھی کہ کسی طرح

طے شدہ بات کو ختم کروا دے ___ چائے کے بعد بیگم غوری نے خود ہی بات چھیڑی اور تصویر دکھا کے اس کی رائے معلوم کی۔

"حال ہی میں کینیڈا جانے والا ہے۔" آخری جملہ انہوں نے بڑی مسرت سے کہا تھا۔

"چچی ___" زیب سنجیدہ ہو کے بولی۔ "نہ جانے ہمارے والدین باہر جانے والے لڑکوں کو اس قدر اہمیت کیوں دیتے ہیں، حالانکہ سو میں سے چند ہی میرے خیال میں اپنے اصل مقصد پر کاربند رہتے ہوں، ورنہ ہمارے پاکستانی لڑکوں کی اکثریت اُس سیلاب رنگ و بُو میں اس بُری طرح ڈوبتی ہے کہ وطن کی محبت کے ساتھ اپنے دین سے بھی بیگانہ ہو کے رہ جاتی ہے۔ رہی والدین اور بھائی بہنوں کی محبتیں، تو یہ تو ان کے لیے بڑی ہی معمولی حیثیت رکھتی ہیں ___ اور مجھے تعجب ہے چچی، آپ اپنی لاڈلی بیٹی کو یوں خوشی سے کالے کوسوں دور بھیجنے پر رضامند ہیں ___ آج کو ہماری بہن ہمارے لیے بیگانہ کیوں ہوئی؟ آپ جانتی ہیں ___" اس کی آواز بھرّا گئی۔ "بیاہ کے بعد ہم اس کی صورت کو ترس گئے ہیں۔ اُس کا حال تک معلوم نہیں ہوتا۔"

"کیا ثمر اور اُس کے شوہر نے وہیں کی رہائش اختیار کر لی ہے؟" بیگم غوری نے آہستہ سے پوچھا۔

"جی ___" اُس نے لب دبا کے آنسو ضبط کیے۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ ریحان احمد کے ساتھ وہاں خوش رہے گی؟" زیب

نے پھر کہا۔

"یہ تو قسمت کی بات ہے بیٹیا"۔ بیگم غوری نے آہستہ سے سانس بھر کے کہا لیکن اس حقیقت سے دل اُن کا بھی دھڑک اٹھا تھا۔

"چلیے قسمت کی بات سہی ——— لیکن کل کو اگر خدانخواستہ اُسے کوئی تکلیف ہوئی تو اپنے وطن میں وہ ہم کو آپ کو پکار تو سکتی ہے اپنا دکھ کہہ سکتی ہے، اپنا درد سنا سکتی ہے ——— لیکن وہاں ——— نہ چچی"۔ اس نے کانوں کی لوئیں چھو کے کہا۔" میں اپنی پیاری سارو کو اس قدر دُور بیاہنے کا مشورہ نہیں دوں گی، آگے آپ جانیں، اس کی ماں ہیں۔ میں بھلا کیا چیز؟"

"نہیں بٹیا ایسا نہ کہو ——— سہیلی سب سے بڑی دوست ہوتی ہے۔ دراصل رشتے تو بہت ہیں بٹیا، یہیں اپنے وطن میں، مگر ریحان احمد سے اچھا مجھے کوئی نظر نہیں آتا ——— میں نے شہنا کو بہت لاڈ پیار سے پالا ہے زیب بیٹیا، ایک تکلیف نہیں ہونے دی ——— اور چاہتی ہوں ایسی ہی جگہ بیاہوں جہاں وہ ہر طرح سے خوش رہ سکے ——— رشتے تو بیشمار ہیں مگر کہیں اچھا کماتا ہے تو گھر بھرا پُرا ہے اور شہنو کو میں ساس نندوں کے جھگڑے میں نہیں پڑنے دینا چاہتی ——— پھر کوئی اکیلا بالا ہے تو پوسٹ اچھی نہیں ——— اور میں کہتی ہوں تنخواہ اتنی تو ہو کہ میری بچی تکلیف میں نہ رہے۔ حال کے ساتھ مستقبل بھی محفوظ رہے"۔

"اور اگر آپ کو ایسا رشتہ وطن میں ہی مل جائے"۔ زیب نے مسکرا

کے کہا ۔

"تو بچّی پھر بتاؤ ـــــ اس سے بڑی اور کیا بات ہوگی ۔"

"تو پھر آپ سارہ کو میری بھابی بنا دیجیے ۔" زیب نے کہا اور بیگم غوری چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہ گئیں ـــــ پھر آہستہ سے بولیں :

"مگر سیٹھ جی نے تو تمہارے چچا سے کبھی ذکر نہیں کیا ۔"

"میں ابّو سے بات کروں گی چچی ۔" زیب کا لہجہ خوشی سے بھرپور تھا ۔" وہ میری بات نہیں ٹالتے ۔ آپ یہ بتائیے، مسز فاروقی کو جواب دے دیں گی نا ـــــ"

"عقل کا تقاضا تو یہ ہے بٹیا کہ جواب فی الحال نہ دیا جائے، ہاں تم کہو تو ابھی انہیں ٹالے رکھتی ہوں ۔" بیگم غوری نے کہا ۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے چچی ۔" وہ جلدی سے باہر نکل کے شہنا کے کمرے کی طرف دوڑی ۔

زیب بھائی کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا ۔ سرخی مائل سلک کی قمیص نیلی جدید تراش پینٹ میں اُسے اپنا بھائی بہت مسرور نظر آیا ـــــ آئینے کی سطح پر بہن کا عکس دیکھ کے مسکرایا ۔

"کیا نماز پڑھنے جا رہی ہو ؟" شرارت سے بولا ۔

"نماز پڑھ کے آرہی ہوں۔" وہ ہنسی اور اپنے سیاہ دوپٹے کو سر پر مزید سنوارتے ہوئے بولی۔ "اور اب ابّی حضور کے روبرو جارہی ہوں تاکہ جناب کی کچھ سفارش ہو۔"

"جاؤ، رب راکھا ــــ" وہ کنگھا ڈریسنگ ٹیبل پر پھینک کے اُس کی طرف مڑ گیا۔

"اگر حالات ساز گار رہے تو ٹھیک ــــ ورنہ پھر ہمیں بھی ابّو کے حضور پیشی دینا ہی پڑے گی۔"

زیب مسکراتی ہوئی اُس کے کمرے سے نکل آئی ــــ باپ کے کمرے کے سامنے رُک کر اس نے ماحول کا جائزہ لیا ــــ پردہ سرکا ہوا تھا۔ سیٹھ وصی کرُسی کی پشت سے ٹِکے کچھ سوچ رہے تھے۔ دائیں ہاتھ میں سُلگتا ہوا سگار تھا اور نگاہیں سامنے خلا میں مرکوز تھیں ــــ زیب آہستگی سے اندر داخل ہوگئی۔ تب انہوں نے اُسے دیکھا اور شفقت سے مسکرا دیے۔

"آج زیبا جی کیسے آگئیں؟" پیار سے بولے۔

"ابّو جی۔" وہ ان کے سامنے کرسی پر جمتے ہوئے بولی۔ "میرا اکیلے میں جی گھبرانے لگا ہے اور ــــ کچھ بھیّا بھی آج کل اداس رہتے ہیں ــــ"

"اور اس کا علاج ہم جانتے ہیں۔" معنی خیز مسکراہٹ ان کے لبوں پر تیر گئی۔

"آپ جانتے ہیں"۔ زیب پلکیں جھپک کے باپ کو دیکھنے لگی۔

"ہاں"۔ انہوں نے سگار لبوں سے لگا کے کش کھینچا اور بولے۔

"بہت جلد ہم خالد کی شادی کر دیں گے"۔

"کیا آپ نے کہیں سوچا ہے ابو"۔ زیب گھبرا کے بولی۔

"ہاں" وہ اس گھبراہٹ سے لاعلم کہتے رہے۔"میں نے رحیم جی موتی والا کی بڑی لڑکی کے لیے بات کی ہے اُن سے —— بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ خود خواہش مند ہیں —— میں تم لوگوں سے ذکر کرنے کا سوچ ہی رہا تھا —— اگلے ہفتے کھانے پر انہیں بلواؤں گا تاکہ تم لوگ زلیخا کو دیکھ لو"۔

"مگر ابو خالد بھیا تو ——" وہ ہکلائی۔

"خالد کو ہماری پسند پہ اعتراض کا حق نہیں ہو گا"۔ سیٹھ وصی نے بیٹی کی بات کاٹ کے کہا۔"جو ہم بہتر سمجھتے ہیں وہ نہیں سمجھ سکتا —— جاؤ اُسے ہمارے فیصلے سے آگاہ کر دو"۔

زیب شکستہ قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ گئی —— اور کچھ ہی دیر بعد سیٹھ وصی نے دیکھا —— خالد کی سیاہ گاڑی گیٹ سے نکل رہی تھی اور وہ بیٹے کا جواب جان گئے تھے —— اُٹھے اور زیب کے کمرے کی طرف بڑھ آئے اور زیب سے انہیں معلوم ہو گیا کہ خالد زلیخا موتی والا سے شادی کے لیے کسی صورت بھی رضامند نہیں۔

"وہ آئے تو اُسے میرے کمرے میں بھیجنا"۔ سیٹھ وصی نے کہا اور ماتھے پر شکنیں سمیٹے زیب کے کمرے سے نکل گئے۔

اُسی رات خالد آیا اور بہن سے ملنے کے بعد باپ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ زیب بھی اس کے ساتھ تھی۔

سیٹھ وصی نے اسے گہری نظروں سے دیکھا ـــــ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے:

"ہاں تو صاحبزادے ـــــ تم کس امر کی بنا پر رحیم جی کی بیٹی کو ناپسند کرتے ہو؟"

"اس لیے ـــــ" خالد نے آہستہ سے کہا ـــــ "کہ میں چچا غوری کی بیٹی سارہ سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"غوری۔" سیٹھ وصی ہنس پڑے ـــــ "غوری بھلا کیا دے دے گا بیٹی کو، اس کے پلّے کچھ ہے بھی ـــــ بس ظاہری پوزیشن ہے جو تھوڑی بہت ہے؛ ورنہ میں جانتا ہوں، چھوٹی موٹی جائیداد مکان اور ٹوٹی پھوٹی گاڑی کے علاوہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ـــــ ایمانداری اور شرافت میں ہی اُلجھے رہے میاں ـــــ اگر انہیں مستقبل کا خیال ہوتا تو آج لاکھوں میں کھیل رہے ہوتے۔ ریاض احمد تمہارے باپ کے ہم پلّہ نہیں میاں صاحبزادے ـــــ اس لڑکی کا خیال چھوڑ دو سمجھے۔"

"آپ ان سے کیا چاہتے ہیں؟" خالد سنجیدگی سے بولا۔

"سیٹھ وصی کی بہو کی حیثیت سے عالی شان جہیز ـــــ" وہ لفظ چبا کے بولے۔ "اور اپنی تجارت میں ایک حصہ دار ـــــ سمجھے اور تمہارے چچا غوری میاں ہزاروں برس بھی محنت کریں تو اس مرتبے کو نہیں پہنچ

سکتے، سمجھے۔" اُن کی آواز اونچی ہوگئی۔

"جہیز تو وہ بڑا عالی شان تیار کر رہے ہیں ابّو!" زیب نے دبی زبان میں کہا — تو وہ ہنس کے بولے:

"اور جہیز کے ساتھ بیٹی کو وداع کر کے میاں غوری خالی رہ جائیں گے — اور مجھے ایسے پھٹیچر سمدھی کی ضرورت نہیں — سیٹھ رحیم جی موتی والا کی ضرورت ہے، سمجھے۔"

"لیکن ابّو، ہمیں دولت کی کیا کمی ہے۔" خالد نے لب چبا کے کہا: "کیا یہ سب کچھ جو ہمیں میسّر ہے، کافی نہیں ہے —" وہ چند لمحے بیٹے کی طرف دیکھتے رہے، پھر آہستہ سے بولے۔

"دولت کی کمی ہے — دولت کی کمی ہے میاں صاحبزادے، اگر کچھ نہ کیا گیا تو کل تم کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاؤ گے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابّو؟" زیب گھبرا کے بولی۔

"میں صحیح کہہ رہا ہوں۔" ان کا لہجہ دھیما تھا۔ "پچھلے دنوں ہماری مل کو لاکھوں کا نقصان ہوا ہے۔ سیٹھ نبی بخش جن کا میں مقروض ہوں، اُن کے اور چند ساتھیوں کے علاوہ اور کسی کو ابھی علم نہیں۔ اس لیے سیٹھ رحیم جی موتی والا کی خواہش کے تحت ان کی بیٹی کو خالد سے بیاہ دینا چاہتا ہوں تاکہ رحیم جی کا ساتھ میری ڈوبتی ہوئی ساکھ کو سہارا دے سکے۔ اس لیے ہم نے زلیخا موتی والا کو بیاہ کے لانا ہے، سمجھے۔" انہوں نے خالد کی طرف انگلی اٹھا کے زور سے کہا۔

زیب خاموش سی رہ گئی ــــ لیکن خالد پر سکون تھا اور اس کا چہرہ ہر قسم کے تذبذب سے پاک، ہولے سے بولا:

"دولت چھاؤں ہے ــــ جب نہیں تھی جب بھی آپ زندہ تھے جب تھی اُس وقت بھی آپ زندہ تھے ــــ اور اگر کل خدا نے مفلسی دی، تب بھی انشاءاللہ ہم زندہ رہیں گے اور ہمیں رہنا ہوگا۔"

"تم بے وقوف ہو لڑکے۔" سیٹھ غرائے۔ "تمہیں بیاہ کرنا ہوگا اور سیٹھ موتی والا کی لڑکی سے کرنا ہوگا، سمجھے ــــ ورنہ ــــ ورنہ میرے گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

"میں آج ہی اِلوصی چھوڑ دوں گا۔" خالد نے خود اعتمادی سے کہا۔

اور سیٹھ وصی کے پُر جلال چہرے پر سرخی چھا گئی:

"ٹھیک ہے، تم جا سکتے ہو۔"

خالد پلٹا ــــ اور اس سے پہلے کہ وہ دروازے سے باہر نکلتا، زیب دوڑ کے اُس سے لپٹ گئی ــــ

"ابّو ــــ" وہ زور سے بولی۔ "کیا بھیّا کے جانے کے بعد وہی نہیں ہوگا جس سے آپ بچنا چاہتے ہیں ــــ"

تب آہستہ آہستہ سیٹھ وصی کا تنا ہوا چہرہ بھی ڈھیلا پڑ گیا۔ خالد نے بہن کے ہاتھ ہٹا کے پھر جانے کی کوشش کی ــــ لیکن باپ کی آواز پر اسے رُک جانا پڑا۔

"یہاں آؤ خالد۔" انہوں نے ہلکے سے پکارا۔ وہ پلٹ گیا ــــ

چہرے پر تناؤ تھا بھنویں بہ کھنچی ہوئی تھیں اور لب بھینچے ہوئے تھے —— سیٹھ وصی تلخی سے ہنس دیے :

"خالد میاں"، انہوں نے قریب آ کے بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "جذباتی آدمی کبھی کامیاب زندگی نہیں گزارتے —— جاؤ ——" وہ ایک بار پھر تلخی سے ہنسے ۔" بیاہ لاؤ، عوزی کی بیٹی کو —— ہم تو گور میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھے ہیں ۔ تمہارا مستقبل تمہیں مبارک ہو۔"

"کیا آپ چچا عوزی سے بات کریں گے ابو ؟" زیب نے مسرت سے کہا ۔

"ہاں"، وہ شکست خوردہ لہجے میں بولے ۔ "میں آج ہی اُس کے پاس جاؤں گا ۔"

دونوں بہن بھائی باپ کے کمرے سے نکلے تو اُمیّد بر آنے کے باوجود ایک عجیب سی خاموشی سے ان کے چہرے منجمد تھے ۔

۱۰

انساں ہوں دھڑکتے ہوئے دل پہ ہاتھ رکھ
یوں ڈوب کر نہ دیکھ سمندر نہیں ہوں میں

اِن حالات میں سیٹھ اسمٰعیل کو نہ جانے کیا سوجھی کہ محفل سماع کا اہتمام کرڈالا۔ شہر کے مشہور قوالوں کو دعوت دی گئی تھی۔ تمام معززین شہر نے شرکت کی تھی ــــ تمام رات کا پروگرام تھا۔ زیب کی دوسری سہیلیوں اور ان کے گھر والوں کے ساتھ سارہ اور اس کے والدین بھی شریک تھے۔

بزرگ خواتین اور دوسری سنجیدہ خواتین اندر کمروں میں تھیں اور لڑکیاں دریچوں سے دیکھ رہی تھیں۔ جہاں سے نیچے صحن کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ قوال اپنے سازوسامان کے ساتھ تیار بیٹھے تھے۔ اُن کے بالکل سامنے سیٹھ رحیم جی کے ضعیف والد حاجی کریم جی تکیوں سے لگے بیٹھے تھے۔ اُن کے اِدھر اُدھر دوسرے سیٹھ حضرات تھے اور درمیان میں ایک دوسرے کے ساتھ لگے ہوئے خالد، اظہر اور دوسرے نوجوان لڑکے سروں پر رومال باندھے ہوئے دو زانوں بیٹھے تھے۔

"کس قدر شریف اور معصوم لگ رہے ہیں یہ لوگ !" زیب کی سہیلی صبیحہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ " جیسے کبھی کوئی شرارت ہی نہ کی ہو!" سب ایک ساتھ ہنس پڑیں۔

قوال اور سازندے اپنی تیاری کر رہے تھے۔ سازندوں کے درمیان

دو قوال تھے جنہوں نے سیاہ واسکٹیں اور سیاہ ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ایک قوال جس نے بقول زیب کے آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر مستی بھی لگائی ہوئی تھی۔ نظر اٹھا کے اوپر دیکھنے لگے، شاید ہنسی کی کھنک نے چونکا دیا تھا ـــــ لڑکیاں ہائے کا نعرہ لگا کے پیچھے ہٹ گئیں ـــــ کچھ دیر دھیمی موسیقی فضا میں ابھری اور ان کے سر پھر بے اختیار دریچوں پر جھک گئے۔ لڑکے یہ جاننے کے باوجود کہ اوپر کچھ چنچل لوگ چلمنوں سے نظارہ کر رہے ہیں ـــــ واقعی بہت شرافت دکھا رہے تھے۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے اور نظریں زانوؤں پہ تھیں اور شاید اسی لیے وہ اس امر سے غافل تھے کہ تالیاں پیٹتے پیٹتے قوال صاحب کچھ لمبی تان لگانے کے بہانے اوپر کے درشن کیا کرتے تھے۔

"اللہ کتنے خراب ہیں یہ لوگ ـــــ" منزّہ نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اللہ رسول کا نام لیتے ہیں، پھر بھی تاک جھانک سے باز نہیں آرہے ـ"

قوالیاں عروج پر تھیں ـــــ جب حاجی صاحب کو حال آنا شروع ہوا وہ دونوں شہادت کی انگلیاں ایک دوسرے میں اُلجھا کے باہیں اونچی کرتے ہوئے دھیمے دھیمے چکّر لینے لگے ـــــ نوجوان لڑکے یک لخت کھڑے ہو گئے۔ ایک دوسرے کے ہاتھ تھام کے انہوں نے حاجی صاحب کے گرد گھیرا ڈال لیا ـــــ اب جس طرف بھی حال کے دوران میں ان کا جھکاؤ ہوتا، نوجوان ہاتھ اپنے زور پر انہیں تھام لیتے ـــــ قوالی ختم

ہوئی تو حاجی صاحب کو بھی سہارا دے کر اُن کی جگہ پر بٹھا دیا گیا ـــــ کوئی تاخیر کیے بغیر قوالوں نے دوسری قوالی شروع کر دی ـــــ اسی دوران میں لڑکوں اور دوسرے لوگوں نے اٹھ کے بڑے ادب سے روپے دونوں ہاتھوں میں لے کے حاجی صاحب کو دینا شروع کیے۔ قوالوں کی طرف سے کوئی آدمی اُٹھ کے آتا اور روپے لے جاتا ـــــ اسی اثنار میں ایک اور شخص کو حال آنے لگا جو حاجی صاحب کی طرح ناتواں نہیں تھا۔ بلکہ ان کے برعکس وہ خاصا صحت مند آدمی تھا۔ اس نے لڑکوں کے ہاتھوں کا گھیرا ابھی توڑ ڈالا اور زمین پر لوٹنے لگا ـــــ لوگ اسے سنبھالتے رہے اور قوالی جاری رہی بلکہ بار بار ایک ہی بول دہرائے جاتے رہے۔

"ہائے اللہ، اس سے تو ڈر لگ رہا ہے۔" تبسّم نے سہم کے کہا اور پیچھے ہٹ گئی۔

"اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے سارہ؟" منزّہ نے اس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں تو سب ڈھکوسلے بازی ہے۔" زیب نے کہا۔

"ہائے، ایسا تو نہ کہو۔" نزہت بولی۔ "ابھی تم نے حاجی صاحب کو نہیں دیکھا تھا ـــــ کس قدر ناتواں ہیں، مگر سرور نے ایک نئی قوت پھونک دی تھی جیسے اُن کے جسم میں ـــــ"

"اور ذرا ادھر تو دیکھو۔" شہنا نے جلدی سے انہیں متوجہ کیا ـــــ "ہاتھ پیر اِدھر اُدھر پھینکتے ہوئے ابھی اس نے اپنا سر کھجایا تھا ـــــ"

لڑکیاں بے اختیار ہنس پڑیں۔

"ایسے میں تو انسان اپنے تن من کی سدھ بھلا بیٹھتا ہے" منزّہ ہنس کے بولی۔ "جوئیں کاٹنے کا احساس بھلا کیسے ہوتا ہے"

"ہاں" تبسّم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "انہیں لوگوں کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے ایک ایسے ہی شخص کو بلوایا تھا جو حال کھیلتا تھا۔ قوالیاں شروع کروائی گئیں ـــ لیکن اس سے پہلے اس شخص کو محل کے ایک چھجے پر بٹھا دیا گیا ـــ قوالیاں پورے زور پر آگئیں، لیکن اُس روز اُس آدمی کو حال نہیں آیا"

"بھلا اُسے اپنی ہڈیاں تڑوانا تھیں" صبیحہ ہنس کے بولی۔

"اور یہ بھی اکبر بادشاہ کا قصّہ ہے" نزہت کو یوں ہی قصّے یاد آتے تھے ـــ اور زیب اور تبسّم اُس کے ان قصّوں میں دلچسپی لیتی تھیں، جلدی سے بولیں:

"ہاں ہاں، کیا تھا؟"

"مشہور ہوا کہ گوالے دودھ میں پانی ملا رہے ہیں ـــ لیکن بادشاہ کی پوچھ گچھ پر گوالوں نے کہا کہ یہ الزام ہے۔ بادشاہ کو فوراً ایک ترکیب سوجھی اور گوالوں کو حکم دیا کہ محل کے خشک تالاب میں ہر گوالا باری باری آئے اور ایک سیر دودھ اس میں ڈالتا جائے ـــ تالاب کو اچھی طرح ڈھک دیا گیا۔ صرف ایک سوراخ رہنے دیا۔ گوالے آتے گئے اور اپنا اپنا برتن تالاب میں خالی کرتے گئے ـــ اگلی صبح

جب تالاب کھولا گیا تو اس میں صرف پانی ہی پانی تھا۔" سب لڑکیاں ہنس پڑیں لیکن صبیحہ خاموش تھی۔ منہ بنا کے بولی۔

"اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"تو بھی گوالوں کی طرح بے وقوف ہی رہی۔" منزّہ نے ہنس کے کہا۔

"اری ہر گوالا اپنی جگہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس کے ایک سیر پانی سے بھلا دودھ میں کیا پتا چلے گا۔" اور تب صبیحہ بھی ہنس پڑی۔

اُسی وقت قوال جو ایک نئی قوالی شروع کر چکے تھے۔ ایک ہی مصرعہ کی تکرار کرنے لگے۔

ع بن دیکھے زمانہ عاشق ہے دیدار کا عالم کیا ہوگا

سارہ کے لبوں سے بے اختیار 'واہ' نکل گیا۔ "عشق رسولؐ کا اظہار ہے۔" صبیحہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

حاجی صاحب پر پھر وجد طاری ہو چکا تھا۔ تب لڑکیاں بھی کتنی ہی دیر قوالی کے بولوں میں گم رہیں۔

"ویسے وجد کی حقیقت سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔" سارہ نے پلکوں کی نمی کو انگلیوں میں جذب کیا۔

"جس طرح موسیقی روح کی غذا ہے، روح پر سرور طاری کر دیتی ہے اس طرح جب دل پہ بات لگتی ہے تو ناممکن نہیں کہ انسان مدہوش ہو جائے۔"

"لیکن لوگوں نے تو ہر جذبے کو ایک کھیل بنا لیا ہے۔" زیب نے

ایک گہرا سانس بھر کے کہا۔

"شاید وقفہ ہو گیا۔" تبسم نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔ "سب اُٹھ کے اندر جا رہے ہیں۔"

اور لڑکیاں دریچوں سے ہٹ کر ہال کمرے میں آگئیں ـــــ زیب اور شہنا مہمان خواتین کو چائے دینے میں ملکہ اور رحمت مائی کا ہاتھ بٹانے لگیں۔

"نیچے دے آئیں چائے؟" زیب نے ملکہ سے پوچھا۔

"کریم ہے نیچے۔" وہ بولی تو زیب کو غصہ آگیا۔

"پہلے ادھر کا بٹا کے آتیں نا، یا رحمت مائی کو بھیج دیا ہوتا۔" وہ سیڑھیوں کی طرف آتے ہوئے بولی۔ "یہی ہوتا ہے اگر سر پر موجود نہ رہو۔ اب دیکھو بھلا ہم یہاں موجود ہیں تو نیچے کا خیال ہی نہیں۔"

"تو آؤ ہم ہی ہو آئیں ذرا نیچے۔" سارہ نے کہا۔

اور جب وہ سیڑھیاں اتر رہی تھیں تو خالد تیزی سے اوپر چڑھا۔ سارہ سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی ـــــ مسکرا کے زیب سے بولا:

"بھئی، ملکہ کو نیچے بھیجو نا ـــــ"

"چلیے ہم چلتے ہیں۔" زیب نے کہا۔ "وہ اوپر چائے دے رہی ہے۔"

"سُنا ہے اوپر سارہ کو حال آگیا تھا۔" سیڑھیاں اترتے ہوئے خالد نے مسکرا کے کہا۔

زیب ہنس پڑی ۔ شہنا نے لب دبا کے اسے دیکھا ـــــ وہ گہری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا ۔ اس نے نگاہ پھیر لی ۔

دونوں کچن میں آ کے چائے کیتلیوں میں ڈالنے لگیں ۔ ٹرے لگا کے کریم کو دی ۔ تب ہی اظہر بھی وہاں چلا آیا ۔

"اوہ خدا کا شکر ہے تم نیچے تو آئیں" وہ بڑے پیار سے زیب کو دیکھ کے بولا ۔

"بے فکر رہیئے ، خالی چائے ملے گی ۔"

اس نے پہلے بہت گھور کے اسے دیکھا ، پھر منہ پھیر کے بولی :

" اتنے مہمان ہیں ، ہو سکتا ہے دودھ کم بھی پڑ جائے ۔"

"کم نہیں پڑ سکتا" وہ جلدی سے بولا ۔ "میں نے ایک سیر پانی ڈلوا دیا تھا ۔" اور سارہ اور زیب نے ہنسنا شروع کر دیا ـــــ تب خواہ مخواہ وہ بھی ان کا ساتھ دینے لگا ۔

"تم کیوں ہنس رہے ہو ؟ زیب نے سنجیدہ ہو کے پوچھا ۔

"تم کیوں ہنس رہی ہو ؟" وہ بھی سنجیدہ ہو گیا ۔

"ہم تو ایک لطیفے پر ہنس رہے ہیں ۔" سارہ نے مزید ہنستے ہوئے کہا ۔

"اوہ ، اچھا ـــــ" اظہر بہت سنجیدہ ہو گیا ۔ "تو پھر واقعی مجھے نہیں ہنسنا چاہیے ۔"

"پوچھیں گے نہیں کون سا لطیفہ تھا ؟" سارہ نے ہنسی روک کے کہا ۔

"کہتی رہو" وہ بے نیازی سے بولا ۔ "سن رہا ہوں"
اور سارہ نے وہ لطیفہ سنانا شروع کر دیا —— ابھی سنا ہی رہی تھی کہ کریم خالی ٹرالی لیے آگیا ۔ اس کے ساتھ خالد بھی تھا ۔
"جلدی ہاتھ چلاؤ زیبا جی" خالد نے کہا اور چائے کیتلی میں انڈیلتی ہوئی سارہ کا ہاتھ کانپ گیا ۔ چائے چھلک کے ہاتھ پر گری اور خالد نے گھبرا کے اس کا ہاتھ تھام لیا جسے اس نے فوراً ہی چھڑا لیا ۔
"بس یہی کام ہیں ان لڑکیوں کے" اظہر بہت بُرا سا منہ بنا کے بولا ۔ اسی وقت ملکہ بھی اوپر سے آگئی ۔
اور وہ دونوں کام اُس پر چھوڑ کے اوپر چلی آئیں —— وقفہ ختم ہو گیا تھا ۔
تبسم سے معلوم ہوا، قوال اپنی جگہ سنبھال چکے ہیں —— کچھ لوگ بھی وہاں پہنچ چکے تھے ۔ مگر اس بار زیب کا موڈ نہیں بنا —— شہنا کا ہاتھ تھامے اپنے کمرے میں آگئی ۔
"کل ابّو تمہارے گھر آئیں گے شہنی، سُنا تم نے" اس نے بڑی مسرت سے اُسے اطلاع دی ۔
"شوق سے آئیں" سارہ نے مسکرا کے کہا ۔ "جو خدمت ہو سکے گی کریں گے"
"خدمت آپ نہیں، چچا اور چچی جی کریں گے" زیب نے شرارت سے کہا ۔ شہنا مسکراتی رہی ۔

"قسم سے سارہ تم بڑی خوش نصیب ہو۔" اپنے بھائی کی ثابت قدمی سے زیب کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

"اور کیا تمہارے بھیّا خوش نصیب نہیں ہیں!" شہنا نے مسکرا کے اپنی ٹھوڑی زیب کے شانے سے ٹکادی۔

"ہاں کیوں نہیں ——" وہ مسکرادی۔ "خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔"

لیکن اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے باہر کوئی بلّی رونے لگی۔ جس سے یقیناً شہنا آخری الفاظ نہ سُن سکی۔ اُس نے لرز کے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

"کس قدر بھیانک آواز ہے۔" شہنا کی آواز کانپ رہی تھی۔

"پاگل ہو۔" زیب نے منہ بنا کے کہا۔ "وہم کرتی ہو —— ویسے تو بڑی روشن خیال بنتی ہو —— اور لوگ تو اتفاقات کو حادثات سے تشبیہ دیتے ہیں، کیا تم بھی ان میں شامل ہوگئی ہو شہنو ——"

شاید زیب اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانا چاہتی تھی۔

"اتفاقات ہی سے تو ڈر لگتا ہے زیبی۔" سارہ کا لہجہ اب بھی لرز رہا تھا۔

"آؤ، چلو ان لوگوں کے پاس چلتے ہیں۔" زیب نے اس کے چہرے پر دیکھ کے کہا۔

اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چلتی ہوئی باہر نکل آئیں ——

دیکھ کتنا تجھے چاہا ہے کبھی غور تو کر
ہم تو ایسے کبھی اپنے بھی طلبگار نہ تھے

شہنا اور خالد وصی بڑی خاموشی کے ساتھ منسوب ہو گئے ــــ بیگم غوری حیران تھیں ــــ سیٹھ وصی جیسے بڑے آدمی کو اکلوتے بیٹے کی منگنی یوں چپ چپاتے کر دینا کچھ زیب نہیں دیتا تھا ــــ لیکن ریاض احمد خوش تھے کہ توقع کے مطابق سیٹھ وصی نے بیجا نمائش سے احتراز کیا تھا ــــ مہمانوں میں خالد کے چند دوست اور زیب کی سہیلیاں تھیں ــــ عزیز رشتہ داروں میں بھی اظہر کے والدین کے علاوہ اور کوئی نہ تھا ؛ البتہ منگنی کا سامان سیٹھ وصی کی شایان شان تھا۔ فیروزی رنگ کی بنارسی ساری کے ساتھ فیروزے کا سیٹ تھا اور اس کے ہم رنگ سینڈل پرس اور دوسری بے شمار اشیائ۔

شہنا کو من کی خوشی مل چکی تھی مگر نہ جانے کیوں آج اُس کی روئی روئی سی آنکھیں برس پڑنے کو بیتاب تھیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ خوشی کے اس موقع پر خالد کا حسین پیکر اس کے سامنے ہو اور وہ اس کے سینے سے لگ کر اتنے آنسو بہائے کہ پھر کبھی زندگی میں کوئی آنسو آنکھ سے نہ ٹپکے ــــ لیکن ایسا نہیں ہوا اور آنسو بڑی خاموشی سے اس کے دل پر گرتے رہے ــــ پہلے زیب اور

اُس کی سہیلیاں اُسے چھیڑتی رہیں ——— وہ سب انگوٹھی پہنا کے سرِ شام ہی واپس چلے گئے تھے ——— مگر ان کے جانے کے بعد خاندان کی لڑکیوں اور لڑکوں نے اس کا سانس لینا اجیرن کر دیا ——— لیکن سارہ کی سمجھ میں خود بھی نہ آتا تھا کہ آخر اِس خوشی کے جذبے پر یہ بے نام سی اداسی کیوں مسلّط ہے ——— جی رہ رہ کے خالد کے دیدار کے لیے تڑپتا تھا اور خالد کے تصور میں ڈوبی وہ یوں ہی مہمانوں میں گھری بیٹھی رہی ——— یہاں تک کہ سوچ کے خمار سے اُس کی آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہونے لگے ——— تب کسی نے کہا:

"شہنی کو نیند آ رہی ہے"

لڑکیاں ابھی اُسے چھوڑنے کو تیار نہ تھیں۔ لیکن بیگم غوری نے زبردستی اُٹھوا کے اُسے اُس کے کمرے میں بھجوا دیا ——— تب مہمانوں کی محفل بھی درہم برہم ہو گئی۔

لیکن الوصی کے کسی بھی باسی کی آنکھوں میں نیند کا پتا نہ تھا ——— زیب کی کچھ سہیلیاں جا چکی تھیں لیکن کچھ ابھی موجود تھیں ——— خالد کے دوستوں کی کچھ بہنیں بھی ابھی بیٹھی تھیں۔ جن کے ساتھ اظہر بڑی دیر سے گپیں ہانک رہا تھا ——— خالد دوستوں سے محوِ گفتگو تھا۔ نیچے سٹنگ روم میں اظہر خلیل کے والدین اور سیٹھ وصی کسی سنجیدہ موضوع پر بات کر رہے تھے اور جس کا سُراغ تبسّم اور نزہت ابھی کچھ دیر پہلے لگا کے آئی تھیں ——— لیکن یہ بات انہوں نے چُپکے

سے زیب کو بتائی تھی اور جواب میں خاصی بڑی ڈانٹ کھانا پڑی۔
پھر ملکہ ٹرے میں پھلوں اور میوہ جات کی پلیٹیں لیے ہوئے ہال میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ہی کریم چائے کی ٹرے اٹھائے آ گیا۔ اظہر نے آگے بڑھ کر اپنی مدد اُسے پیش کی ۔۔۔ ملکہ پلیٹیں درمیانی میز پر چن چکی تھی۔ اس نے ٹرے بھی میز پر رکھ دی۔

"تم لوگ جاؤ، چائے ہم خود بنا لیں گے۔" زیب نے کہا۔

"چلیے، اجّی بھائی آج آپ سہی ۔۔۔" صبیحہ نے ہنس کے کہا۔ اور اظہر جلدی سے میز پر جھک گیا۔

"ہاں ہاں ۔۔۔ مگر میرے سر میں سخت درد ہے اس لیے ۔۔۔۔۔" اُس نے پیالی بنائی اور ایک ہی سانس میں خالی کر گیا ۔۔۔ اس کے بعد دوسری اور پھر تیسری۔

"یہ کام تو کھوٹا ہے ۔۔۔" صبیحہ اٹھ کے دوڑی اور ساتھ ہی نزہت بھی چلی آئی۔

وہ تیسری پیالی لیے میز سے ہٹ گیا: "دراصل یہ کام ہی تم لوگوں کا ہے۔" اس نے گھونٹ بھر کے کہا۔

لوگ اُٹھ اُٹھ کے میوے اور پھل اپنی پلیٹوں میں لیتے گئے اور موقع پا کے اظہر نے چوتھی پیالی بھی بنا لی۔

"ارے جاؤ خدا کے لیے۔" زیب نے چلّا کے کہا۔ "چائے بناؤ تم لوگ۔" صبیحہ اور نزہت ایک بار پھر اُٹھیں ۔۔۔ ایک چائے بناتی

رہی اور دوسری مہمانوں کو پیش کرتی رہی ـــــ لیکن بمشکل چند پیالیوں کے بعد
ملک پوٹ خالی ہو چکا تھا ـــــ ادھر اظہر جو زیب کے برابر بیٹھ چکا تھا
زیب کے قریب جھک کے کہنے لگا :

"تمہاری بلّی چائے بنا رہی ہے۔ دیکھو کہیں دودھ نہ پی
جائے"

"خاموش رہو" زیب نے منہ بنا کے کہا ـــــ تب ہی صبیحہ
زور سے بولی :

"ارے زیبی، دودھ تو ختم ہو گیا اتنی جلدی ـــــ"

زیب نے حیرانی سے صبیحہ کی طرف دیکھا۔

"دیکھا، میں نہ کہتا تھا" اظہر ہنس کے بولا۔

"چپ رہو" زیب نے کہا۔ "میں اُسے دیکھ رہی ہوں۔ وہ
چائے بنا رہی تھی"

"تو خرگوشنی نے پیا ہو گا" اُس نے کہا۔

زیب نے نزہت کے چہرے کی طرف دیکھا اور نہ جانے اُسے
کیوں اظہر کے خطاب پر ہنسی آئی۔ اس نے زور سے کہا :

"کیوں نزہت تم تو نہیں پی گئیں دودھ؟"

لمبوترے چہرے والی گورے رنگ کی نزہت نے چونک کے پہلے
اظہر اور پھر زیب کو دیکھا اور مسکرا دی۔

"میں نے تو نہیں، البتّہ تبسّم اور منزّہ پر شک کیا جا سکتا ہے۔"

اُس نے اپنی دونوں سہیلیوں کے کالے رنگ پر چوٹ کی۔ تب اظہر بول پڑا۔

"تم نے کبھی چھچھوندر کو بھی دودھ پیتے دیکھا ہے ــــ اور مینڈکی توزکام میں بھی مبتلا ہو سکتی ہے۔"

"اجی!" زیب زچ ہو کے چیخی۔ "خدا کے لیے ــــ" اپنی سہیلیوں کی ناراضگی کے ڈر سے وہ گھبرا گئی تھی ــــ اظہر کے دیے گئے خطابات سے اس کی سہیلیاں ابھی تک لاعلم تھیں۔

تب ہی خالد بھی اپنے دوستوں کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اس محفل میں شیر خور کی پہچان کے لیے میرے خیال میں پیالیوں میں بچے ہوئے مائع کے تجزیے سے معلوم کیا جا سکتا ہے ــــ کہ وہ آخر کون ہے؟" خالد نے بآواز بلند کہا اور آہستہ آہستہ اظہر کی طرف بڑھنے بڑھنے لگا جس کے ہاتھ میں پیالی ابھی تک تھی ــــ اور تب ہی اظہر اٹھ کے دروازے کی طرف بھاگا۔

"لیجیے جناب، چور نے بھاگ کے خود اعتراف کر لیا۔" خالد ہنس کر بولا اور اظہر مسکراتا ہوا اپنی جگہ پر واپس آ گیا۔

"جناب ہم ہیں شاہ آدمی ــــ چائے کے بجائے دودھ استعمال کرنے کے عادی ہیں لیکن بالا بد قسمتی سے ایک ایسی ہستی سے پڑا ہے جو حد سے زیادہ کنجوس ہے ــــ چائے پلا کے کلیجہ راکھ کر دیا ہے ــــ"

"وہ کون ہے؟" زیب کے پاس بیٹھی ہوئی وحید کی بہن عصمہ

نے شرارت سے کہا۔

"چور نے گھور کے خود اعتراف کر لیا ـــــ" اظہر نے بُری طرح گھورتی ہوئی زیب کی طرف انگلی اٹھائی۔ لڑکیاں ہنس پڑیں۔

"ہونہہ ـ" زیب جل کر بولی ـــــ "آپ کو ـــــ اور میں دوں گی چائے بنا کے، شکل دیکھی ہے۔"

"ارے تم کیا دو گی ـــــ کام چور۔" وہ منہ چڑا کے بولا۔ "منع کر دیا ہوگا اپنی ملکۂ عالیہ کو سارے کچن پر اُن ہی کا راج چلتا ہے ـــــ کبھی دودھ مانگو تو منہ دیکھنے لگتی ہے جیسے اردو سمجھتی ہی نہ ہو۔"

"ارے بھئی، کیوں ملکہ کے بچے پر ظلم کرتے ہو۔" خالد کے ایک دوست نے شرارت سے کہا۔

اظہر بے ساختہ جھینپ گیا۔ لڑکیاں منہ دبا کے ہنسنے لگی تھیں ـــــ زیب ملک پوٹ اُٹھا کے باہر نکل گئی۔ واپس آئی تو ہنس کے بولی:

"جائیے جناب، میں ملکہ سے کہہ آئی ہوں۔ وہ بے چاری ہمیشہ مذاق سمجھتی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آپ واقعی بھوکے ہیں۔"

"شکریہ آپ کی سخاوت کا۔" اظہر منہ بنا کے بولا اور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ زیب نے سب کو چائے بنا کے دی اور رات ہونے سے پیشتر ہی یہ محفل اختتام کو پہنچی۔

اور بستر پر لیٹتے ہی گزرا ہوا ہنگامہ پرور دن خالد کے ذہن میں

پھرنے لگا۔ غوری لاج سے واپسی پر لڑکیاں اُسے شہنا کی باتیں بتا رہی تھیں ـــــ صبیحہ دانت بھینچ کے بولی:

"اللہ خالدی بھیا ـــــ اس قدر کیوٹ لگ رہی تھی نا سارہ کہ بس آپ دیکھتے ـــــ"

"کاش ـ" خالد نے دل میں کہا ـ "میں اُسے دیکھ سکتا۔"

"اور انگوٹھی پہناتے ہوتے جب سنہری ستاروں کے جال والا سرخ دوپٹہ اُسے اوڑھایا تھا نا بھیا ـــــ" زیب نے کہا "تو قسم سے سچ مچ کی اتنی حسین دلہن لگ رہی تھی۔"

"تو کیا وہ میری جھوٹ موٹ کی دلہن تھی ـــــ" خالد نے مسکرا کے کہا اور زیب ہنس دی۔

"میری حسین دُلہن ـــــ" اس نے آنکھیں موند کے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔

"میں کب تمہیں دیکھ پاؤں گا۔ دلہن کے اس روپ میں ـــــ"

"ہائے خالدی بھیا ـــــ تصورات کی دنیا میں اڑ رہے ہیں۔" تبسم نے ہنس کے کہا۔

"رہنے دو ـــــ مت جگاؤ ـــــ" اظہر خاصا سنجیدہ ہو رہا تھا۔ "یہ تصورات ہی زندگی کا حسین ترین سرمایہ ہوتے ہیں۔"

"جب کرو گے بات بے تکی کرو گے۔" زیب نے غصّے سے کہا۔

"ارے تم کیوں جھگڑتے ہو بھئی۔" گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے شعیب

نے کہا ــــ اور آنکھیں مونڈے ہوتے خالد کے ذہن پر اداسی کی ایک سرد سی لہر آئی تھی۔

"میرے تصورات میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ اجی۔ یہ تم نے کیا کہہ دیا۔" اس نے تڑپ کے آنکھیں کھول دیں ــــ مغموم سی نگاہوں سے اظہر کی طرف دیکھا۔ نہ جانے کیوں دل کانپ سا رہا تھا ــــ اجی شرمندہ تھا ــــ اور تب وہ خود بخود ہنس دیا۔

"یہ کیا پاگل پن ہے خالدی صاحب ــــ" اس نے خود سے کہا۔ "یہ اس قدر وہمی کیوں ہو گئے ہو۔"

گاڑی الوصی کے گیٹ پر رُکی تو ہنستے شور مچاتے لوگوں کو دیکھ کر اس نے بھی طبیعت کو بدل دیا۔

مگر تنہائی پاتے ہی شہنا کے حسین خیال کے ساتھ وہی بے نام سی اداسی کی لہر پھر اٹھی تھی ــــ کتنی دیر تک وہ جاگتا رہا ــــ پھر نجانے رات کے کون سے پہر نیند کی دیوی نے اسے اپنی آغوش میں بھر لیا ــــ اور وہ اپنی ہر سوچ سے آزاد ہو کے خوابوں کے مزے لینے لگا۔

١٢

وہ مُحبّت کی نگاہِ اوّلیں یادش بخیر
ایک کانٹا ہے جو دل میں رہ گیا ہے ٹوٹ کر

اظہر کے باپ مظہر صدیقی سیٹھ وصی سے بیاہ کی تاریخ لے گئے تھے ــــــ اور شادی کے لیے کراچی میں ہی مقیم اپنے ایک دوست شیخ ارجمند کے ہاں آ گئے تھے ــــــ تیاریاں بڑے زور شور سے ہوئی تھیں ــــــ خالد نہیں چاہتا تھا کہ اس کی عزیز بہن کو کسی کمی کا احساس ہو۔ جس طرح اب تک اُس نے زندگی گزاری تھی وہ چاہتا تھا اسی شان سے وہ الوصی سے وداع ہو۔ وہ جانتا تھا ــــــ بیٹی کو سب کچھ بخش کے اس کا باپ بالکل خالی ہو جائے گا ــــــ لیکن اُسے اپنے زورِ بازو پر بھروسا تھا ــــــ سارہ کا ساتھ لے کر وہ اپنی زندگی کو ایک نئے سرے سے تعمیر کرے گا ــــــ اُس نے سوچا تھا اور زیب کی شادی بڑی شان سے ہوئی ــــــ شادی کا انتظام وسیع پیمانے پر تھا۔ بڑے بڑے لوگوں نے کثرت سے شرکت کی۔ سارہ بھی اپنے والدین کے ساتھ شریک تھی ــــــ وہ اس سے ملا تھا۔ لیکن ظاہر ہے یہ ملاقات تشنہ رہی۔

عنابی رنگ کی قیمتی اور کامدار ساری میں وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ اس سے مل کے بات کر سکے۔۔

منگنی کے بعد وہ الوصی نہیں آئی تھی۔ وہ غوری لاج گیا بھی تو اس سے ملاقات نہ ہو سکی ـــــ ہاں ـــــ بیل پر انگلی رکھتے ہی اُس کی نگاہ اوپر اس کے کمرے کی کھڑکی پر ضرور رہتی تھی اور ایک لمحے کا درشن ہی دل کی خوشی کا باعث تھا ـــــ کبھی کبھار ریسیور اٹھا کے یوں ہی اس کے نمبر گھما دیتا ـــــ اکثر وہی ریسیو کرتی ـــــ مگر درشن لے کے اور آواز سن کے ملاقات کی آرزو زور پکڑتی تھی ـــــ یوں وہ بہن کی شادی کا شدت سے منتظر تھا ـــــ کئی بار اندر کی جانب گیا اور مایوس لوٹ آیا ـــــ سوچا ضرور زیب سے لگی بیٹھی ہوگی۔ اندر کی جانب جاتے ہوئے ایک بچے کو پکڑا، پیار سے کہا۔

"اندر جا کے شہنا باجی سے کہو، ڈیڈی باہر بلا رہے ہیں۔"

بچہ اندر گیا اور وہ وہیں اس کی آمد کا منتظر رہا ـــــ توقع نہیں تھی کہ وہ اس قدر تیزی سے باہر آئے گی ـــــ سر جھکائے ہوئے خالد سے بُری طرح ٹکرا گئی۔

"سنبھل کے، سنبھل کے۔" اُسے بازوؤں سے تھام کے اس نے رسان سے کہا۔

"وہ ـــــ ڈیڈی ـــــ" شہنا گھبرا کے بولی۔

"وہ میں ہی ہوں۔" خالد نے مسکرا کے کہا۔

"جی ـــــ" اس نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

"تمہارا نہیں۔" وہ مسکرایا۔ "آنے والے کچھ لوگوں کا ـــــ"

شہنا کے چہرے پر مُسکان پھیل گئی ـــــ اور جس میں حیا کے رنگ کی آمیزش تھی۔

"شہنی ـــــ" خالد نے اس کے آنچل سے کھیلتے ہوئے پیار سے پکارا۔

شہنا نے نگاہ اٹھا کے دیکھا ـــــ ہلکے رنگ کے سوٹ اور گہری ٹائی میں وہ کس قدر سمارٹ اور وجیہہ لگ رہا تھا ـــــ اور سامنے کھڑا ہوا اپنا سا شخص اس لمحے شہنا کو اس قدر اچھّا لگا کہ نگاہ چند لمحے کو اٹکی رہ گئی۔

"وہ آپ کا شکریہ ادا کرتا ہے شہنا جی۔" وہ جُھک کے بولا۔

"آپ نے اُسے قبولیّت کا شرف بخشا ـــــ" شہنا کی پلکیں حیا کے بوجھ سے جُھک گئیں۔ اس نے خالد کے سامنے سے ہٹنا چاہا، لیکن وہ ایسا نہ کر سکی ـــــ ساری کا آنچل خالد کے ہاتھ سے لپٹ گیا تھا۔

"آپ سے اچھّا تو آپ کا لباس ہے۔" وہ شرارت سے ہنسا۔ تب دھیمی سی مسکان اس کے لبوں پر اُتر آئی۔

"ہم یہ ساری گھر جا کے آپ کو بھجوا دیں گے۔" اس نے ہولے سے کہا اور وہ زور سے ہنس دیا۔

"آج آپ نے ایک بہت پرانی یاد دلا دی سارہ۔" ایک دبا دبا سانس بھر کے اُس نے ہولے سے کہا۔ "جب ہم پہلی بار ملے

تھے "۔

" اور دل کے پھول کھلے تھے "۔ اظہر کی شریر آواز پر وہ دونوں چونک گئے ــــ کریم کلر سوٹ اور سرخ گلاب کے ہاروں میں لدا ہوا شریر اور معصوم اجی ان دونوں کو بڑا پیارا لگا ــــ لیکن اس کی شریر نگاہوں میں معنی خیز چمک تھی۔

" شیطان "۔ خالد جھینپ کے ہنس دیا ــــ اور شہنا آنچل چھڑا کے جلدی سے اندر چلی گئی۔

" آج تو اپنی شرارتوں سے باز آگیا ہوتا ــــ" خالد نے سنجیدہ ہو کے کہا۔

" آج ہنسنے دو بھیّا ــــ پھر تو عمر بھر رونا ہے "۔ اظہر مسکین صورت بنا کے بولا۔ " وہ ایک لطیفہ......"

" اجّی "۔ خالد بہت زیادہ سنجیدہ ہو گیا "۔ منہ سے ہمیشہ اچھی بات نکالا کرو "۔ اُس کے چہرے پر بہن کا پیار اُمنڈ آیا تھا ــــ اگلے ہی لمحے وہ ہنس کے بولا۔

" مگر بھیّا تم نکل کیسے آئے وہاں سے ــــ؟"

" پیر میں کھجلی ہو رہی تھی "۔ وہ مسکرایا۔ " اور کیا ہو گا "۔

خالد ہنس پڑا : " ایک جگہ تو ٹکتے ہی نہیں تمہارے پیر "۔

" ایمان سے خالدی "۔ وہ منہ لبسور کے بولا " ہو رہی تھی ــــ ابا جی سے کہا تو وہ بھی یہی کہتے تھے۔ بڑی مشکل سے آنے دیا ــــ"

"پھر دور ہوئی" وہ مسکرایا۔

"چلتے ہی" اظہر مسکرا کے بولا۔

اور خالد اس کے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے زور سے ہنس پڑا:

"بڑے شیطان ہو یار ۔۔"

پھر وہ دونوں پھر سے مہمانوں میں آ ملے ۔۔۔ برات کراچی سے ہی آئی تھی۔ کیونکہ وہ چند دن پہلے ہی شیخ صاحب کے ہاں آ گئے تھے ۔۔۔ نرگس اور عندلیب جو شیخ صاحب کی بیٹیاں تھیں، انہوں نے سارا انتظام سنبھال لیا تھا اور دونوں لڑکے امجد علی اور شاہد علی اپنے دوستوں کے ساتھ اظہر اور مظہر عالم کا ساتھ دے رہے تھے۔ ویسے تو دونوں ہی گھرانے غیر ضروری رسموں کے خلاف تھے ۔۔۔ لیکن لڑکیوں کی ضد پر تمام چھوٹی چھوٹی رسمیں ادا کی گئیں ۔۔۔ مایوں، مہندی ابٹن وغیرہ ۔۔۔ شہنا ہر دن شریک ہوتی رہی تھی۔ مگر خالد آخر دن تک بہن کے بیاہ کے انتظام سے مطمئن نہ تھا ۔۔۔ اسے اپنے دل کا خیال نہ آیا ۔۔۔ اب وہ پر سکون تھا ۔۔۔ اور رخصتی کی آخری رسم میں جب اس نے سکون کا سانس کھینچا، شہنا کا خیال بھی سانس کے ساتھ چلا آیا تھا ۔۔۔ ملاقات خوش کن سہی ۔۔۔ مگر لمحات اداس تھے۔ اس کی پیاری بہن عمر بھر کے لیے اس سے جدا ہو رہی تھی ۔۔۔ برات جانے کے بعد وہ خاصا مضمحل سا ہو گیا تھا ۔۔۔ رات نیند بھر کے سو بھی نہ سکا ۔۔۔ لیکن اگلے ہی دن وہ پھر ہشاش بشاش ہو گیا تھا۔

صبح ہی جگا دیا گیا۔ معلوم ہوا، لڑکیاں زیب کو لینے جانے کے لیے تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں ـــــ اور اس کے دوست گاڑیاں لیے بالکل تیار کھڑے تھے ـــــ وہ جلدی سے باتھ روم میں گھس گیا۔ چند منٹ میں تیار ہو کر باہر نکلا تو باہر وہی مناظر تھے ـــــ تبسم بال سلجھا رہی تھی تو اب بھی سلجھا رہی تھی ـــــ تبسم اور صبیحہ آئینے سے چپکی میک اپ کر رہی تھیں ـــــ تو اب بھی کر رہی تھیں۔ عاصمہ منزّہ کو ساری باندھ رہی تھی تو ابھی تک فال درست نہ ہوتے تھے ـــــ بڑی بوڑھیاں اس ہنگامے سے دُور نہ جانے کہاں تھیں۔ خالد ڈریسنگ روم سے ہٹ کے باہر کی طرف آ گیا ـــــ شنا کہیں نظر نہیں آئی تھی ـــــ وہ اداس سا ہو گیا ـــــ اور جب باہر سے گاڑیوں کے ہارن ایک آواز سے تان لگانے لگے ـــــ تب کہیں جا کے وہ باہر نکلیں ـــــ سارہ سب سے پیچھے تھی۔ آگے آنے والی تمام لڑکیاں جلدی سے گاڑیوں میں گھس گئیں اور سارہ حیران سی کھڑی رہ گئی۔

"ارے پریشان کیوں ہوتی ہو۔" وحید نے ہنس کے کہا۔ "وہاں خالد کے ساتھ کی سیٹ خالی ہے۔"

"تم آگے چلی جاؤ پلیز۔" اس نے خالد کی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تبسم سے کہا۔

"نہ بابا"۔ تبسم جان کے اُسے ستا رہی تھی۔

"جلدی کرو لڑکیو ـــــ" اگلی گاڑی سے سیٹھ وصی کی آواز

آئی اور سارہ بادل نخواستہ پلٹ کے اس کے برابر آ بیٹھی ـــــ خالد نے کنکھیوں سے اُسے دیکھا۔ سرمئی رنگ کی بنارسی ساری میں تھی ـــــ تراشیدہ بال کرل کیے ہوئے تھے ـــــ ہلکے میک اپ اور زیوروں کے ساتھ بہت پیاری لگ رہی تھی ـــــ آج خالد بھی کچھ کم نہیں تھا ـــــ گہرے چاکلیٹی سوٹ میں اُس کی وجاہت خاصی نکھر آئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی نگاہوں کو بھلے لگے ـــــ اسی لیے بار بار نگاہیں اُٹھ جاتی تھیں ـــــ کبھی نظر ٹکراتی تو شہنا انجان سی بن جاتی ـــــ جبکہ خالد پر شوق نگاہوں سے اُسے دیکھتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رحمان اور وحید کی تیز ڈرائیونگ کے باعث سب سے پیچھے تھا۔

ایک بار رحمان نے جان بوجھ کے پیچھے رہتے ہوئے کھڑکی سے باہر سر نکالا اور زور سے کہا:

"خالد بھائی، آگے پٹرول پمپ پڑتا ہے ـــــ وہاں رُکنا چاہیے آپ کو۔"

خالد چونک پڑا ـــــ لیکن ذہن کھویا ہوا تھا، طنز کو نہ سمجھ سکا ـــــ اور واقعی کچھ دیر بعد وہ گاڑی ایک پٹرول پمپ میں داخل کر چکا تھا ـــــ اگلی گاڑی سے قہقہوں کی آواز کے ساتھ ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکیاں بھی ہنس پڑیں۔

"کیا ہوا؟" خالد نے پلٹ کے پوچھا۔

"کیوں مستقبل یاد آ رہا ہے کیا خالدی بھیا ـــــ" تبسم نے ہنس

کے چوٹ کی۔

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔" وہ مسکرایا۔" لیکن آپ کیوں خوش ہوئے۔"

"آپ پٹرول ڈلوائیے گاڑی میں، پھر معلوم ہو جائے گا۔۔۔" صبیحہ نے مسکرا کے کہا۔

تب خالد واقعی ہوش میں آگیا۔۔۔ خاموشی سے مسکراتے ہوئے گاڑی واپس موڑ لی۔

شیخ ولا میں ان کا استقبال بڑے پُرجوش انداز سے کیا گیا۔۔۔ جو شرارتیں برات میں اُن سے کی گئی تھیں سب کا بدلہ موجود تھا۔۔۔ ویسے ہی موٹی موٹی لکڑیوں پر دکھانے کو پھول لپیٹ دیے گئے تھے اور اچھی خاصی پٹائی کر ڈالی تھی۔

"ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور۔۔۔" رحمان نے لکڑی سے بچتے ہوئے کہا۔

"مگر بھئی آپ لوگوں کو تھوڑی مارنا چاہیے۔" سارہ نے احتجاج کیا۔" ایسا تو لڑکی والوں کی طرف سے ہوتا ہے۔"

"تو آپ کیوں روکتی ہیں۔" خالد نے گہری نظر سے اُسے دیکھا۔ "کرنے دیجیے انہیں تجربہ۔"

"رسم ہی تو ہے، ہم نے بھی اپنا لی۔۔۔" عندلیب نے ہنس کے سارہ کو جواب دیا۔

اور یوں ہی ہنستے شور مچاتے سب نے زیب کے کمرے پر دھاوا بول دیا۔

"اب وہ آپ کی نہیں رہیں" نرگس نے بن کے کہا۔" اب زیادہ حق ہمارا ہے اُن پر "

"واہ" صبیحہ بول پڑی۔" ناخنوں سے بھی کبھی گوشت جدا ہوتا ہے "

"ارے خالدی —— ان لوگوں میں کہیں لڑائی نہ ہو جائے" خالد کے ایک مزاحیہ دوست عبدالحق نے کہا —— اور لڑکیاں ہنس دیں۔

اُسی شام ولیمے کی رسم انجام پائی —— اور لڑکیاں ایک بار پھر تبدیل ہوکے زیب کے ساتھ شیخ وِلا میں جا پہنچی —— تمام لڑکیوں نے غرارے سوٹ پہنے تھے —— کھُلے ہوئے دوپٹوں میں خالد کو وہ سب کس قدر مشرقی لگیں —— اور شہنا ان سب سے الگ —— نارنجی غرارہ سوٹ میں شعلہ لگتی تھی —— خالد جیسے جلنے لگا —— اس بار بھی لڑکیوں نے کچھ ایسی کارستانی کی تھی کہ اُسے خالد کے برابر سیٹ ملی؛ حالانکہ وہ زیب کے ساتھ بیٹھنا چاہ رہی تھی —— اور اس قرب سے خالد جیسے پگھلا جا رہا تھا —— لیکن اس بار اس نے خود پر قابو رکھا —— نظر کو بھٹکنے نہیں دیا —— بلکہ بدستور اُس سے باتیں کرتا رہا۔

"سارہ یہ —— سارہ وہ ——" نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں —— ولیمے کی تقریب کے بعد یہ لوگ اظہر اور زیب دونوں کو واپس لیتے آئے۔ منظر عالم اسی دن سوار ہو گئے —— کیونکہ تجارت میں غیر حاضری اُن کی

برداشت میں نہ تھی۔ انہوں نے اظہر کو بھی تاکید کی کہ اب وہ ذمّہ دار ہو گیا ہے اس لیے غیر سنجیدگی سے کام نہ لے ــــ اور یہ صحیح تھا کہ پہلے انہوں نے اس پر زیادہ روک ٹوک نہ کی تھی ــــ وہ مہینوں کراچی میں رہ جاتا، انہیں پروا نہ تھی ــــ مگر بیاہ کے بعد وہ اس کی غیر ذمّہ داری کو قطعی مناسب نہ سمجھتے تھے ــــ منظر عالم کے جانے کے بعد ان کے دن رات سیر و تفریح میں گزرنے لگے تھے ــــ

۱۳

فراز کس کے ستم کا گلا کریں کس سے
کہ بے نیاز ہوئی خلق بھی خدا کی طرح

پک نک کے لیے بڑی خوبصورت جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ شیخ صاحب کے گھر سے اُن کے بچے خالد کے دوست اور زیب کی سہیلیاں سارہ سمیت سب گاڑیوں میں لد کے مقررہ جگہ جا پہنچے —— سب ہی نے شوخ رنگ کے کپڑے پہنے تھے —— سارہ نے نیوی بلیو فلیپر دوپٹہ اور گلابی پھولوں والی گہری نیلی چست شرٹ پہنی تھی —— زیب بھی سادہ سے سرخ فلیپر اور زرد پھولوں والی شرٹ میں تھی۔ اس نے اپنی ساس کے کہنے کے باوجود کوئی بھڑکیلا کپڑا نہیں پہنا تھا —— اور نہ ہی کوئی زیور —— بھلا وہ اپنا لباس اور زیور سنبھالتی یا پچنک مناتی۔ ویسے بھی بھاری لباس میں جھکے جھکے وہ خاصی اُکتا گئی تھی ——

"آج تم بالکل ماضی کی زیب لگتی ہو ڈارلنگ" اظہر نے اُسے گہری نظر سے دیکھ کے کہا —— اور جواب میں زیب نے اسے منہ چڑا دیا۔

"ہاں بھئی زیب" وحید کو پرانی بات یاد آئی۔ "آج آپ اور شہنا باجی اپنا کمال بھی دکھا دینا —— وہی"

زیب کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے پلٹ کے دیکھا، اجی ہنس رہا تھا۔

"پہلے ذرا گھومتے ہیں ـــــ پھر سہی ۔" شہنا نے کہا ـــــ اور سب ننگے پاؤں ٹھنڈی ریت پر چلنے لگے ۔ کچھ لوگ چست لباس میں رائیڈنگ کر رہے تھے ـــــ زیب کا دل بھی چاہنے لگا ۔

"اللہ ہم بھی رائیڈنگ کریں اجّی ۔" اس نے کہا اور اظہر اور شعیب آگے بڑھ کے گھوڑے والوں سے بات کرنے لگے :

"کتنے گھوڑے لیے جائیں ؟" اظہر نے پلٹ کے کہا ۔

لڑکوں میں وحید، رحمان، امجد اور شاہد اور لڑکیوں میں تبسم، زیب، صبیحہ اور نرگس آگے بڑھ آئیں ۔

"بس بھئی ـــــ" اس نے کہا اور شہنا کی طرف دیکھ کے مسکرانے لگا ۔ "آپ نہیں ۔"

"جی نہیں ۔" شہنا سہم کے بولی اور اپنی جگہ سے کچھ اور پیچھے ہٹ گئی ـــــ سب نے گھوڑوں کی باگیں سنبھالیں ۔ سب سے پہلے اظہر نے ایڑ لگائی ـــــ اور اس کے ساتھ ہی سب نے ـــــ گھوڑے سرپٹ بھاگ لیے ـــــ خالد جو سارہ کی طرف دیکھ رہا تھا، قریب چلا آیا ـــــ

"اگر آپ اس کی ہمراہی میں رائیڈنگ کریں ـــــ تو کیا تب بھی آپ خوف کھائیں گی ۔"

"جی ـــــ" اُس نے آہستہ سے کہا ۔

"اس پر اعتماد نہیں ؟" خالد نے لب دبا کے کہا ۔

"اعتماد تو ہے، اتفاقات سے ڈر لگتا ہے۔"

"اتفاقات سے نہیں ڈرنا چاہیے شہنو ـــــ" وہ ہنسا۔ "قسمت جو کھیل دکھائے اُس کے لیے ذہن کو تیار رکھنا چاہیے۔"

"ذہن ـــــ" اس نے ایک نظر خالد کو دیکھ کے نظریں جھکا لیں۔ "پر دل پر بس نہیں کیا جا سکتا ـــــ اُسے کیسے تیار کیا جائے۔" اسی وقت نزہت نے اُسے آواز دے کے کہا:

"آؤ سارہ، سیپیاں دیکھیں ـــــ"

"ہونہہ، کیا بچوں کی طرح۔" منزہ نے سر جھٹکا ـــــ مگر سارہ خالد کے قریب سے ہٹ کے ان کی طرف چلی گئی۔

تب وہ ٹھنڈی ریت پر بیٹھ گیا ـــــ "شہنا۔" اس نے ریت کے ذروں میں اپنی نگاہیں جذب کیں ـــــ "میں تمہیں سمجھ نہیں پاتا شہنی ـــــ تمہاری شخصیت کے بہت سے ٹکڑے ہیں۔ تم کبھی شہنا بن جاتی ہو، کبھی سارہ ـــــ مگر نہیں، تم اپنے نام کا دوسرا حصہ ہو جو کبھی پکارا نہیں جاتا ـــــ ساحرہ ـــــ" اُس کی انگلی ریت پر پھرنے لگی ـــــ

"شہنا، سارہ، شہنی، سارو، شہنو ـــــ ساحرہ ـــــ" اُس نے باقی تمام نام مٹا ڈالے ـــــ تم ساحرہ ہو ـــــ تم ایک جادوگرنی ہو، جس نے میری ہستی کو اپنے حصار میں، اپنے ـــــ جادوئی حصار میں قید کر رکھا ہے ـــــ میں نکلنا بھی چاہوں تو نہیں نکل سکتا ـــــ" مگر وہ مسکرایا ـــــ "میں یہ چاہتا بھی نہیں ـــــ ہاں، میں تمہارے سحر میں گرفتار رہنا چاہتا

ہوں ــــ"

وہ سب ٹھنڈی ریت پر بیٹھی ہوئی بھیانک موجوں کو دیکھتی رہیں، پھر رائیڈنگ کے بعد زیب، تبسم، صبیحہ اور نرگس بھی ان سے آ ملیں۔ لڑکے سوئمنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔

"خدا کے لیے زیب انہیں منع کرو۔" شہنا نے سہم کے کہا "کیسی بھیانک منہ پھاڑے آتی ہیں موجیں ــــ"

"ارے چھوڑو بھی ــــ وہمی لڑکی۔" زیب لاپروائی سے بولی ــ "جو قسمت میں ہو اُسے کون روک سکتا ہے۔"

"اللہ، کس قدر پتھر دل ہو ــــ" صبیحہ، شہنا کی ہم خیال تھی۔ "نئی نویلی دُلہن ہو، تمہیں تو ، ایسے لمحات سے خوف کھانا چاہیے ــــ"

"ارے جاؤ ــــ" وہ ہاتھ جھٹک کے بولی اور لڑکوں کی طرف بڑھ گئی۔

"اے بھیّا۔" پکار کے بولی۔ "آپ نہ جائیں، سارہ گھبرا رہی ہے ــــ" خالد نے بے ساختہ پلٹ کے دیکھا۔ بھیگی بھیگی دو گہری آنکھیں اس کے سامنے تھیں ــــ اور تب اُس نے اُتارا ہوا کوٹ دوبارہ پہن لیا۔

"اوئے ڈر گیا ــــ" رحمان نے مضحکہ اڑایا۔

"نہیں رحمان۔" وہ ایک گہرا سانس بھر کے بولا: "کسی کی آنکھوں نے پہلی بار التجا کی ہے ــــ لڑکے سارہ کی طرف دیکھنے لگے جواب اپنی

روئی روئی آنکھیں پانی میں جذب کیے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی ـــــ
لڑکے سوئمنگ لباس میں خود کو موجوں کے سپرد کرنے کے لیے پر تولنے لگے ـــ خالد سگریٹ سلگا کے یوں ہی کنارے کنارے ٹہلنے لگا۔
لڑکے تیرتے ہوئے خاصے دُور نکل گئے، کبھی کبھار کسی کو اُبھرنے والی موج خود میں چھپا لیتی تو لڑکیوں کے سانس رک جاتے، پھر پانی کی سطح پر اس کا سر اُبھرتا تو سینے میں رُکے ہوئے سانس آزاد ہو جاتے ـــــ اظہر جو کچھ زیادہ ہی جوشیلا تھا، سب سے آگے نکل گیا موجیں اُبل اُبل کے ابھرتی تھیں ـــــ اور ـــــ تب زیب کا دل بھی دھڑکنے لگا ـــ وہ گڑگڑا کے دل ہی دل میں خدا سے دُعا مانگنے لگی ـــــ اور پھر یہ ایک نئی نویلی سہاگن کی دُعاؤں کا بھی اثر تھا کہ بپھری ہوئی موجیں نرم روی سے اچھلنے لگیں اور تمام لڑکے بخیریت کناروں پر آ گئے۔

"اللہ کا شکر ہے لاکھ لاکھ!" سارہ نے زیب کو لپٹا لیا۔ "میری تو جان پر بنی ہوئی تھی۔"

"اگر وہ بھی چلے جاتے تو کیا ہوتا۔" زیب نے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے پیار سے دیکھا اور وہ شرما گئی ـــــ وہ سب لباس تبدیل کر کے انہی کی طرف آ رہے تھے۔

"اچھا تو اب آپ بھی اپنا کمال دکھا دیں۔" اظہر نے اُن کے قریب ریت پر بیٹھ کے پیر پھیلاتے ہوئے کہا۔ خالد اور دوسرے لڑکے بھی ان سے قریب ہی بیٹھ گئے۔

"اچھا تو سارہ ۔" زیب نے اُسے ہوشیار کیا اور خود جا کے سامنے ایک پتھر پر بیٹھ گئی ۔ "آپ کو کوئی بھی چیز پسند ہو، سارہ کے کان میں کہہ دیں میں بتا دوں گی ۔"

"نہیں، تبسم کے کان میں ۔" سارہ نے جلدی سے پاس بیٹھی سہیلی کی طرف اشارہ کیا ۔

"چلو کسی کے کان میں بھی ——" رحمان نے ہنس کے کہا ۔ "تم سب لڑکیوں کے کان ایک جیسے ہوتے ہیں ۔"

"یعنی کچّے ۔" شاہد نے اپنے الفاظ پر زور دے کے کہا ۔

"اور دیکھو، ایک بڑا پیارا لطیفہ یاد آ رہا ہے مجھے ۔" اظہر نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا ۔

"نہیں بھئی، یہ نہیں ہوگا ابھی ۔" زیب چیخی ۔

مگر وہ سُنی ان سُنی کرتے ہوئے بولا :

"میاں بیوی کی لڑائی ہوگئی ۔ بیوی بولی : تم مردوں کی تو عادت یہی ہوتی ہے کہ ایک کان سے سنو اور دوسرے سے اڑا دو —— مرد بولا : ہاں ہاں، مگر تم عورتوں کی عادت ہے، سُنیں دونوں کانوں سے اور نکال دیں منہ سے ۔" سب خاصے محظوظ ہوئے ۔

امجد بولا : "میاں بیوی کی لڑائی پر مجھے بھی ایک لطیفہ یاد آ گیا ۔"

"اللہ بھئی ۔" زیب پاؤں پٹخ کے بولی ۔

"صبر کیجیے بھابھی جی ۔" امجد ہنس کے بولا ۔ "اس میں آپ کی

انسلٹ نہیں ۔"

"تو پھر نہیں ہوگا بس ۔" اظہر نے اس کی بات کاٹی ۔

"اچھا، اچھا ۔ سناؤ ۔" زیب مسکرانے لگی ___ اور اظہر قہقہہ لگا کے ہنس پڑا ۔ "اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر میں ایسے ہی بہت سے لطیفے سنا دوں گا ___ کسی طرح تمہارے کمال سے تو پیچھا چھوٹے ۔"

"سناؤ امتو ۔" زیب نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بڑے لاڈ سے امجد کی طرف دیکھا ۔

"وہ یہ ہوتا ہے کہ ___" اس نے کہنا شروع کیا ۔ "دو میاں بیوی موٹر میں کہیں جانے کے لیے نکلتے ہیں ۔ راستے میں لڑائی ہو جاتی ہے ۔ جس سے بیوی کا منہ پھول جاتا ہے ۔ میاں نے بہت منانے کی کوشش کی مگر وہ منہ سے نہ بولی ۔ آخر سڑک پر ایک گدھے کو دیکھ کے اُسے شرارت سوجھی، بولا : چلو مجھ سے نہیں بولتی تو اپنے رشتے دار کو تو سلام کر دو ۔ بیوی نے پہلے غصے سے اس کی طرف دیکھا، پھر شرارت سے مسکرا دی، کھڑکی سے باہر سر نکال کے بولی : جلیٹھ جی سلام ۔" اس پر سب بے تحاشا ہنسنے لگے ۔

"اچھا جی ۔" شعیب سنجیدہ ہو کے بولا : "اب آپ شروع ہو جائیں ۔"

"اچھا ۔" زیب نے ہنستے ہوئے کہا ۔ "میں چلتی ہوں سارہ، تم ہوشیار ہو جاؤ ۔"

"زیب ایسا کرو" سارہ جلدی سے اٹھ گئی۔ "تم میری جگہ آ جاؤ ـــــ اور میں ـــــ"

"نہیں، کان تمہارے ہوں گے" خالد نے اس کا ہاتھ کھینچا۔

"یہ شرط ہے"

اور سارہ جلدی سے گھبرا کے بیٹھ گئی۔

"مجھے کیک پسند ہے" اس کے بیٹھتے ہی تبسّم نے اُس کی طرف جُھک کے کہا۔

"بتاؤ تبسّم کو کیا پسند ہے؟" سارہ نے کہا۔ "گلاب جامن"

"نہیں" زیب زور سے بولی۔

"برفی"۔

"یہ بھی نہیں"

"قلاقند"۔

"یہ بھی نہیں"

"لڈّو"

"نہیں"

"کیک"

"ہاں" زیب نے کہا۔

اور سب حیرت سے اُس کی جانب دیکھنے لگے۔

"نہیں بھئی، یہ تم لڑکیوں کی مسکوٹ ہے"۔ رحمان ماننے کو

تیار نہ تھا۔

"اچھا تو چلیے آپ اپنی پسند بتا کے دیکھ لیں"۔

"اچھا"۔ وہ مسکرایا۔ "مجھے ٹینڈے پسند ہیں"۔

"کیک"۔ سارہ نے زور سے کہا۔

"نہیں"۔ زیب کی آواز بھی بلند تھی۔

"بھنڈی"!

"نہیں"۔

"توری"۔

"نہیں"۔

"قلاقند"۔

"نہیں"۔

"لڈو"

"نہیں"۔

"ٹینڈے"۔

"ہاں"۔ وہ ہنس پڑی — اور سب تالیاں پیٹنے لگے۔

"واہ بھئی، کمال کر دیا۔ وحید نے حیرت سے کہا۔

"حیرت نہ کرو"۔ اظہر شان سے بولا۔ "ہماری قربت کا اثر ہے"۔

پھر سارہ کی طرف کھسک کے بولا۔ "لاؤ اب میں بتاؤں"۔

"بتائیے"۔ زیب مسکرائی۔

اظہر جھکا اور اس کے کان کے قریب منہ لے گیا —— اور سارہ چیخ پڑی۔

"اللہ اجی بھیّا ——"

"کیا بہت سڑی ہوئی چیز کا نام لے دیا۔" شاہد نے ہنس کے کہا۔

"جی نہیں۔" سارہ نے کان سہلاتے ہوئے کہا۔ "کاٹ لیا۔"

"مچھّر نے۔" اظہر انجان بن کے بولا۔ سب ہنس دیے۔

"خالدی تم بتاؤ جی۔" شعیب نے کہا۔

"بہتر۔" خالد مسکرایا۔ پھر جھک کے سرگوشی سے بولا:

"تم۔"

سارہ کا چہرہ گلابی ہو گیا —— لب دبا کے دھیمے سے بولی: "یہ کون سا پھل ہے یا مٹھائی؟"

"ان سب سے بڑھ کے۔" وہ پیار سے بولا۔

کسی اور نے اب تک نہیں سنا تھا۔ انہیں مسکراتے دیکھ کے امجد بولا:

"چلیے، آپ آواز تو لگائیے۔"

تب وہ بھی شرارت سے مسکرا دی، زور سے بولی۔ "رس گلّے"۔

جواب ملا: "نہیں۔"

"لڈّو۔"

"نہیں۔"

"تم ـ"

"ہاں ـــ تم ـ" زیب ہنس پڑی اور خالد تالیاں بجانے لگا۔

ایک لمحے کے لیے کوئی نہ سمجھ سکا ـــ مگر جب سمجھے تو سب کافی دیر تک ہنستے رہے۔

"میری پسند کریلے ـ" خالد کے ایک دوست یوسف نے کہا۔

اور وہ بول پڑی: "ٹینڈے ـ"

"نہیں ـ"

"بھنڈی ـ"

"نہیں ـ"

"لڈو ـ"

"نہیں"

"کریلے ـ"

"ہاں ـ" تالیاں پھر بجنے لگیں۔

"لیکن جناب، یہ اتنی ساری سبزیوں میں بھلا لڈو کا کیا کام؟" شعیب پاس بیٹھے رحمان سے بولا۔

"میں سمجھ گیا۔" رحمان نے چونک کے کہا۔ "لڈو کے بعد وہ اصل چیز کا نام لیتی ہے ـ" وہ ہولے سے بولا۔

"ہوں ـ" شعیب شرارت سے مسکرایا۔ "مجھے لڈو پسند ہیں ـ" اس نے سارہ سے کہا۔

سارہ ان کی شرارت کو سمجھ گئی ۔ بولی : "زیبا جی ہوشیار، شیعب بھائی کی پسند بتاؤ ۔ گلاب جامن ۔"

"نہیں ۔" وہ مسکرائی ۔

"رس گلے ۔"

"نہیں ۔"

"قلاقند ۔"

"نہیں" ۔

"لڈو ۔"

"جی ہاں ۔"

شعیب ایک لمحے کو چونکا ۔ پھر ہنس کے بولا ۔

"ترکیب نمبر دو استعمال کی ہوگی ۔"

"اچھا جی چھوڑیں یہ ـــــ کوئی پیارا سا گیت ہو جائے ۔" زیب مسکرا کے بولی ۔

"سنائے گا کون ؟" امجد نے کہا ۔ "کیا آپ ؟"

"نہیں آپ ۔"

"یہ کیا آپ آپ کی رٹ لگا رکھی ہے لکھنوی حضرات کی طرح ۔" اظہر نے کہا ۔

"اللہ کے واسطے ۔" زیب نے بڑی التجا سے کہا ۔ اس وقت کوئی لطیفہ نہیں ۔ خالدی بھیا، آپ سنائیں ۔" وہ بھائی کی طرف جھکی ۔

" وہی :

ع جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں "

"نہیں" خالد نے مسکرا کے کہا۔ "موقع نہیں ہے"

وہ خاصے موڈ میں تھا —— بڑی بے باکی سے رفیع کا مشہور گیت گنگنانے لگا —— "چھو لینے دو نازک ہونٹوں کو ——" گھمبیر آواز میں گیت بہت خوبصورت لگا —— لیکن سارہ بہت خاموش تھی —— جیسے خالد کی یہ بے باکی اسے پسند نہ آئی ہو —— نہ جانے کیوں وہ آج اس قدر شوخ ہو گیا تھا۔

اور جب خالد کے بعد سب نے سارہ سے فرمائش کی تو اسی گیت کے جواب میں اُس نے ایک بہت پیارا گیت اپنی مدھم آواز میں سنایا۔ جیسے لہریں سبک رفتاری سے بہہ رہی ہوں۔

پیار کوئی بول نہیں پیار کوئی آواز نہیں
ایک خاموشی ہے سُنتی ہے کہا کرتی ہے
نہ یہ رُکتی ہے نہ بجھتی ہے نہ ٹھہری ہے کبھی
نور کی بوند یہ صدیوں سے بہا کرتی ہے
ہم نے دیکھی ہے ان آنکھوں کی مہکتی خوشبو
ہاتھ سے چھُو کے اِسے رشتوں کا الزام نہ دو
پیار کو پیار ہی رہنے دو کوئی نام نہ دو

سارہ کے اس گیت کو بہت سراہا گیا۔

اس کے بعد کئی لوگوں نے اپنی اپنی پسند کے گیت اور غزلیں سنائیں۔ کچھ تھوڑا بہت کھایا پیا گیا ـــــ اور شام پڑنے سے پہلے ہی واپسی کی تیاریاں ہونے لگیں ـــــ سب گاڑیوں میں سوار ہوئے تو اظہر نے زور سے نعرہ مارا :

"پکنک ڈے زندہ باد"

اور تمام گاڑیاں سٹارٹ ہو کے آگے بڑھ گئیں۔

ایک ماہ کراچی میں گزار کے اظہر بیوی کے ساتھ پنڈی روانہ ہو گیا ـــــ اور زیب رخصت ہوئی تو الوصی ویران ہو گیا ـــــ سیٹھ اسمٰعیل کو دل کے دَورے پڑنے لگے تھے۔ خالد کو باپ کی عزّت کا پاس بھی تھا اور اپنے مستقبل کی فکر بھی ـــــ بہت خاموشی سے نوکری کی تلاش میں تھا ـــــ لیکن ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ کراچی کے بجائے وہ دوسرے شہروں میں ملازمت کا خواہش مند تھا تاکہ باپ کی بنی بنائی عزّت خاک میں نہ مل جائے ـــــ اس کے جاننے والے اسے دوسرے شہروں سے اطلاعات بہم پہنچا رہے تھے ـــــ لیکن ابھی تک اُسے اپنی من پسند ملازمت نہیں ملی تھی۔

سیٹھ وصی کمزور ہو گئے تھے۔ ساری زندگی کی مے نوشی اثر دکھا رہی تھی بڑھاپے میں ـــــ یا پھر حالات کا تقاضا تھا جو ان کی ہڈیوں نے سہارا دینے سے انکار کر دیا تھا ـــــ وہ بستر سے لگے ہوئے تھے ـــــ

سانس آتی تھی ـــــ اور جاتی تھی۔ آخر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ بھی ٹوٹ گئی ـــــ تیسرا پڑنے والا دورہ جان لیوا ثابت ہوا ـــــ اور خالد کی کوئی کوشش کارگر نہ رہی ـــــ ریاض احمد نے خالد کا بھرپور ساتھ دیا۔ موت کے بعد بھی اُن ہی کا سہارا تھا کہ خالد نے ہوش و حواس قائم رکھے۔ زیب اطلاع ملتے ہی آ پہنچی ـــــ تعزیت کے لیے آنے والے بےشمار لوگوں میں سیٹھ نبی بخش بھی تھے۔ انہوں نے بہت خلوص سے اظہارِ تعزیت کیا ـــــ لیکن جاتے جاتے وہ خالد کو یہ احساس بھی دلا گئے کہ اس کا باپ کچھ بخشنے کے بجائے اُسے محروم کر گیا ہے۔

انہوں نے کہا:

"کھالد میاں، ہم کو امیّد ہے تم اپنے باپ کا روح کو ہلکا کرے گا اور ہم کو بھی پیسہ کا جرورت ہے ـــــ ایک ہپتہ ہم تم کو دیتا ہے۔ انتجام کر لو ـــــ"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا انکل"۔ خالد کا ذہن پریشان تھا۔

"تومارا باپ ہمارا لاکھوں کا کرجدار ہے کھالد میاں ـ تم اِدر سے بھاگ ہو کے کار کھانہ آجانا ـــــ ہمارا مینیجر تم کو حساب کتاب کر لے گا"۔

اور خالد دکھ سے اس بےحس انسان کو تکتا رہا ـــــ جس نے اس کے باپ کا کفن بھی میلا نہیں ہونے دیا تھا ـــــ اس کے باپ کی میّت پر ہی قرض کا تقاضا کر بیٹھا تھا ـــــ کس قدر خبیث ہوتے ہیں

یہ دولت والے "۔ خالد نے رنج سے سوچا۔

زیب اور اظہر کئی دن خالد کے پاس ٹھہرے ـــــ لیکن آخر ایک دن وہ واپس لوٹ گئے ـــــ خالد پریشان تھا ـــــ باپ، لاکھوں کا مقروض تھا۔ اور اس کے اکاؤنٹ میں چند ہزار روپیہ بھی موجود نہ تھا ـــــ خاموشی سے سیٹھ نبی بخش کی جانب سے قرقی کا منتظر تھا ـــــ اور پھر وہ وقت بھی جلد ہی آگیا ـــــ سب مہمان زیب سمیت واپس جا چکے تھے ـــــ وہ الوصی میں تن تنہا تھا ـــــ اپنے کمرے کی ایک کرسی پر سر جھکائے بیٹھا تھا اور باہر الوصی کی رونقوں کا نیلام ہو رہا تھا۔

" ہاں تو صاحب یہ خوبصورت الماری صرف پچاس روپے ہیں ـــــ صرف پچاس روپیہ ـــــ پچاس روپیہ ـــــ سو روپیہ ـــــ سو روپیہ ـــــ ڈیڑھ سو روپیہ ـــــ ڈیڑھ سو روپیہ ـــــ دو سو روپیہ ـــــ تین سو ـــــ تین سو ـــــ پانچ سو ـــــ لیجیے جناب، پانچ میں جا رہی ہے۔ ہیں کوئی صاحب ـــــ اور کوئی پانچ سو روپیہ ـــــ" اس کے کانوں میں کسی کی سخت آواز پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر رہی تھی۔

" ڈریسنگ ٹیبل ـــــ" نیلام کرنے والے کی آواز پھر گونجی۔

" سو روپیہ ـــــ صرف سو روپیہ ـــــ تین سو روپیہ، تین سو روپیہ ـــــ"

اس نے دونوں ہاتھوں سے کان بند کر لیے ـــــ اور پھر نہ جانے کب تک وہ یوں ہی آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا ـــــ اور جب کانوں سے ہاتھ ہٹا کے اس نے آنکھیں کھولیں تو سیٹھ نبی بخش کے ملازم اس کے کمرے کا

سامان لے جا رہے تھے ـــــ شام ہوتے ہوتے نیلام ختم ہوگیا ـــــ اور الوصی ویران ـــــ خالد خالی خالی آنکھوں سے اپنے گھر کو اجڑتے دیکھتا رہا اور خاموش تھا۔

۱۴

اُسے فراز تھا تو بہت شوقِ ہمرہی
راہوں کو، پیچ و خم کو جو دیکھا بدل گیا

زیب ناشتے میں ملازمہ کا ہاتھ بٹا رہی تھی ـــــ اور اظہر برآمدے میں کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا تازہ اخبار کے مطالعے میں منہمک تھا کہ یکایک زور سے بولا :

"زیب ذرا جلدی آؤ"۔

چائے دانی میں چائے ڈالتے ڈالتے وہ چھوڑ کے اُٹھ گئی۔ اظہر خاصا فکرمند اور پریشان تھا۔

"کیا ہوا ؟" وہ گھبرا کے بولی۔

اور اظہر نے اخبار کا وہ صفحہ اس کے سامنے کر دیا،

جو اس کے مطالعے میں تھا۔ زیب کی نگاہیں بے چینی سے سیاہ سطور پر دوڑ گئیں ـــــ سیٹھ نبی بخش اللہ والا جوٹ ملز کراچی کی جانب سے نیلام عام کا اعلان تھا۔

۳۰ ؍جولائی ۱۹۶۳ء بروز منگل صبح دس بجے سیٹھ اسمٰعیل وصی کی کوٹھی کا سامان بذریعہ نیلام عام فروخت کیا جائے گا ـــــ نیلام کی تفصیلی شرائط و قواعد کا اعلان ...... زیب کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگا ـــــ پیارے بھائی کے مستقبل کی تباہی کے خیال سے دل سینے میں ڈوبنے لگا۔

بے اختیار اظہر کے بازو سے لگ کے رونے لگی۔

"ارررر دیوانی ہوئی ہو" اظہر نے بوکھلا کے کہا۔ "اس میں بھلا رونے کی کیا بات ہے ـــــ کیا جانے والی چیز دوبارہ نہیں آسکتی۔"

"میرے بھیا کا کیا ہوگا اجی؟" اس نے سسکی بھر کے کہا۔ "نہ جانے کس بدخواہ کی نظر لگ گئی ہمارے گھر کو ـــــ چلو اجی ہم آج ہی بھیا کے پاس کراچی چلتے ہیں۔"

"ہاں ہاں، تم ناشتا کرو، میں اسٹیشن فون کرتا ہوں۔" اظہر نے کہا اور اٹھ کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔

واپس لوٹا تو زیب ناشتے کی میز پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دونوں نے بمشکل تھوڑا بہت ناشتا کیا اور کراچی جانے کی تیاری کرنے لگے۔

جس وقت الوصی پہنچے شام بڑی اداسی سے ڈوب رہی تھی ـــــ زیب ٹیکسی سے اتر کے دوڑتی ہوئی گیٹ میں داخل ہوگئی ـــــ اپنے گھر کی ویرانی دیکھ کے اس کا دل دہل اٹھا ـــــ باغیچہ اُجڑ گیا تھا۔ بہار روٹھ گئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا، اس کے ہاتھوں لگائے گئے خوش رنگ پھولوں کا بھی آج نیلام ہوا ہو ـــــ مالی بابا کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا ـــــ اس کی نگاہ سامنے اٹھی، برآمدہ بیت کی خوبصورت کرسیوں سے خالی تھا ـــــ اُس نے برآمدے میں چڑھ کے اِدھر اُدھر دیکھا ـــــ بے چین نگاہوں سے اپنے ملازموں کو تلاش کیا لیکن ملکہ، کریم، رحمت مائی، فضلو کوئی بھی نکل کے نہ آیا ـــــ ساری کوٹھی ویران تھی ـــــ ڈرائنگ روم، ہال اور

کمرے جو کبھی قیمتی ساز و سامان سے آراستہ ہوا کرتے تھے، آج کسی مفلس کی جھولی کی طرح خالی تھے ——— وہ ان کے درمیان سے گزرتی ہوئی فرشی قالین سے محروم ننگے فرش پر ہولے ہولے قدم رکھتی اظہر کی ہمراہی میں چل رہی تھی ——— بھائی کے کمرے کے پاس اُس کے قدم رُک گئے ——— دل کی عجیب حالت تھی ——— کمروں کی کھڑکیاں دروازے نفیس پردوں سے خالی تھے۔ کھُلی ہوئی کھڑکی سے اُسے اپنے بھائی کا خوبصورت سیاہ بالوں والا سر جھکا ہوا نظر آ گیا اور وہ تیزی سے اندر داخل ہو گئی ——— اظہر اس کے ساتھ ہی تھا ——— انہوں نے دیکھا ——— وہ ایک کرسی پر سر جھکائے بیٹھا تھا ——— اور شاید وہی شے تھی الوصی کی ——— جسے وہ ظالم لوگ چھوڑ گئے تھے۔ کمرہ کسی بھی قسم کے ساز و سامان سے مبرا تھا ——— یہاں تک کہ دیواروں پر لگی ہوئی خالد کی بنائی ہوئی تصویریں بھی وہ لے گئے تھے ——— اس نے ایک سسکی بھری اور دوڑ کے بھائی سے لپٹ گئی۔

خالد چونک اٹھا ——— آنکھیں کھول کے دیکھا ——— وہ بہن تھی ——— رو رہی تھی ——— تب وہ ہنس پڑا بہت ہولے سے۔

"ارے پگلی، روتی کیوں ہے؟" اُس کی پشت پر پیار سے ہاتھ رکھ کے بولا۔ "تیرا بھائی تو نہیں مر گیا نا۔"

"بھیّا" وہ تڑپ اٹھی ——— اور اپنی انگلیاں بھائی کے لبوں پر رکھ دیں۔ "میرے بھیّا، میرے پیارے بھیّا یہ کیا ہو گیا۔" وہ اس کے شانے سے سر ٹکرا کے رونے لگی۔

"کیا ہوگیا ــــ" وہ مسکرایا۔ "کچھ بھی نہیں ہوا ــــ الوصی کا سامان ہی تو گیا ہے، تیرے بھیّا کے بازوؤں سے طاقت تو نہیں گئی پگلی!"

"یہی میں بھی کہتا ہوں، اِسے ـ" اظہر نے آہستہ سے کہا۔ "خدا ہمارے بھیا کو سلامت رکھے۔ ایسا سازو سامان ایک چھوڑ دس بار لیا جا سکتا ہے ــــ الوصی کا سامان ہی تو گیا ہے، مکیں تو نہیں گئے ــــ"

وہ مسکرایا ــــ اور اب انشاء اللہ الوصی کے مکینوں میں ایک پیارا سا اضافہ ہوگا۔ ہم شہنا بھابھی کو بیاہ کے لائیں گے!"

"ہاں بھیّا!" زیب بھائی کا بازو دبا کے بولی۔

"ہم چچا غوری سے بات کرتے ہیں ــــ اب جلد ہی شہنا کو یہاں آجانا چاہیے ـ"

"سارہ ـ" خالد کی آواز ڈوب سی گئی۔ "وہ آجائے گی!"

اور تب زیب کا دل بھی دھڑک اُٹھا: "کیا اب وہ اپنی بیٹی کو اس اجڑے گھر میں بسادیں گے؟" اُس نے سوچا۔

"مگر خالدی تم نے یہ حالت کیا بنا رکھی ہے اپنی ــــ" اظہر نے کہا اور اس نے مسکراتے ہوئے کرسی چھوڑ دی۔

"فی الحال تم تو بیٹھو اجیؔ ـ" اس نے کہا۔ "میں سٹور سے پرانے قالین نکالتا ہوں ـ"

"چلو میں بھی تمہارا ہاتھ بٹاتا ہوں ـ" اظہر نے کہا۔ "اور زیب تم چائے بناؤ!"

"رحمت مائی ابھی ہیں" خالد نے مڑ کے کہا۔ "میں نے تو انہیں بھی چھٹی دے دی تھی مگر وہ غریب پھر بھی رُک گئیں ـــــ دیکھو وہ کچن میں ہونگی ـــــ"

اور اُن کے جانے کے بعد زیب کچن کی طرف بڑھ گئی۔

اگلے دن وہ غوری لاج پہنچی تو بیگم غوری اُسے برآمدے میں ہی مل گئیں ـــــ اس نے مسکرا کے سلام کیا ـــــ اور خلافِ توقع جواب بے حد سرد مہری سے پایا ـــــ وہ اُداس سی ہوگئی۔

"شہنا کہاں ہے؟" اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

"آؤ، شہنا موجود ہے" وہ بولیں اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئیں۔

شہنا باپ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ اُسے دیکھ کے جلدی سے اٹھ گئی ـــــ دونوں سہیلیاں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں ـــــ پھر شہنا اسے لیے ہوئے صوفے پر آ بیٹھی۔

"ٹھیک تو رہتی ہو اپنے گھر" بیگم غوری نے از راہِ رسم کہا۔

"جی شکر ہے اللہ کا" وہ ہولے سے بولی ـــــ پھر کچھ لمحے بعد اُس نے گہرا سانس بھر کے یوں بات شروع کی:

"بھیا تنہائی کے باعث بہت اداس ہیں چچی ـــــ میرے خیال میں اب بیاہ کے لیے مزید تاخیر نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کیا کہتی ہیں؟"

"دیکھو بیٹیا۔" بیگم غوری نے آہستہ سے کہا۔ "ہمارے خیالات سے تم لاعلم نہیں ہو۔ تم جانتی ہو شہنو کے مستقبل کے فکر سے ہم نے کیسے کیسے رشتے مسترد کیے ہیں ـــــ خالد کو قبول کیا تو اس لیے کہ شہنو خوشحال زندگی بسر کرے۔ اُسے کسی تکلیف کا سامنا نہ ہو مگر اب تم جانتی ہو تمہارے بھائی کے پاس مکان کے علاوہ کچھ بھی نہیں رہا۔"

"بھیّا خالی ہاتھ نہیں ہیں چچی، ان کے ہاتھ میں تعلیم کی دولت ہے۔ کیا وہ اپنا مستقبل خود نہیں بنا سکتے۔" زیب نے غمزدہ لہجے میں کہا۔ "آپ نے کچھ تو دوستی اور محبّت کا پاس کیا ہوتا چچی ـــــ کس آسانی سے آپ نے ہمارا دل توڑ دیا۔"

"نہیں بٹیا، ہمارا مطلب یہ نہیں تھا کہ تمہارا دل ٹوٹے۔" بیگم غوری نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ ہم سارہ کو کسی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ لڑکیاں خالد میاں کے لیے بھی بہت ـــــ مگر بٹیا، تم ہمیں مجبور نہ کرو۔ ہم اپنی بیٹی کو جانتے بوجھتے امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتے ـــــ پھر اللہ کے فضل سے رشتے اب بھی ایک سے ایک اعلیٰ موجود ہیں ـــــ سیٹھ حامد اللہ بہت چاہ رہے ہیں کہ ان کے بیٹے کے لیے ہم سارہ کے واسطے تیار ہو جائیں۔ رحمانیہ اسپورٹ لمیٹڈ کا مینجنگ ڈائریکٹر ہے اُن کا بیٹا اسد اللہ ماشاء اللہ اچھا خوب صورت اور سنجیدہ نوجوان ہے۔ ادھر جیوا اینڈ سنز والوں کا رشتہ بھی ہے ـــــ بہت بڑے لوگ ہیں ـــــ دور دور کاروبار پھیلا ہوا ہے بس ایک صورت شکل میں ذرا دبتا ہوا ہے۔

اور میں کہتی ہوں آج کی دُنیا میں جو کچھ بھی ہے پیسہ ہے جس سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے ـــــ مگر ان کا کہنا ہے شہنا کے لیے خوبصورت داماد دیکھیں گے ـــــ اور پھر میری شہنو کی عمر بھی ایسی کوئی زیادہ نہیں۔ اگلے رجب میں بیس کی ہوگی ـــــ ہمیں افسوس ہے بیٹیا " بیگم غوری نے ہولے سے کہا۔

ریاض احمد سارا وقت خاموشی سے اخبار پڑھتے رہے تھے ـــــ زیب نے ایک گہرا سانس بھر کے سارہ کی طرف دیکھا ـــــ اُس کی پلکیں پھیلی ہوئی تھیں ـــــ اور نگاہیں قالین میں جذب تھیں۔

"اچھا چچی، میں پھر چلتی ہوں " زیب اُٹھ گئی۔

تب سارہ نے نگاہیں اٹھا کے اُسے دیکھا تھا۔ جھلملاتی ہوئی آنکھیں بول رہی تھیں مگر لب ساکت تھے۔

" بیٹھو بیٹیا، چائے پی کے جانا " بیگم غوری نے از راہِ تکلّف کہا۔ مگر وہ نہیں رُکی ـــــ گھر پہنچی تو دل بہت اداس تھا ـــــ حوصلہ نہیں تھا کہ اس دِل شکن جواب سے بھائی کو مطلع کرے ـــــ لیکن حقیقت بہر حال تسلیم کرنا تھی ـــــ آگاہ کیا اور خالد بڑے صبر سے سہہ گیا ـــــ مگر ان سیاہ آنکھوں سے جھانکتا کرب بہن کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکا ـــــ اظہر اور زیب افسردہ تھے ـــــ تسلّی دینے کے واسطے اظہر نے اپنے خاندان کی کئی لڑکیوں کے نام پیش کیے ـــــ مگر وہ خاموشی سے خلا میں تکتا رہا۔

"میں نے سوچ لیا ہے اجی ___" زیب کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔" اب یہاں سے بھیا کا بیاہ کر کے ہی جاؤں گی۔"

" بیاہ بھی ہو جائے گا زیبا۔" خالد نے درد سے ہنس کے کہا۔

" تم دونوں بے فکر ہو کے جاؤ ___ ارادہ ہوا تو اطلاع دے دوں گا ___ فی الحال تو زندگی کو سنبھالنا ہے۔"

تب زیب اور اظہر مایوس لوٹ گئے۔

١٥

یہ سوچا تھا کہ پتّھر بن کے جی لوں

سو اندر سے پگھلتا جا رہا ہوں

باپ کی بنی ہوئی عزت باپ کے ساتھ ہی چلی گئی تھی ـــــ خالد کو ایک آرٹ سکول نے آفر کیا تو وہ اس چھوٹی سی ملازمت کو قبول کرنے پر آمادہ ہوگیا ـــــ اب اس کے پاس رہ بھی کیا گیا تھا، اس فن کے سوا۔ سو وہ اپنے فن میں ڈوب گیا ـــــ سوگوار اور مضمحل سی زندگی گزرتی جا رہی تھی ـــــ الوصی کی تنہائیاں اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھیں ـــــ بعض اوقات تو وہ اس قدر خوفزدہ ہوتا کہ گھبرا کے باہر نکل جاتا اور یوں ہی سودائیوں کی طرح گھنٹوں سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ـــــ ورنہ اپنے درد کو اپنی تنہائیوں کو کینوس پر منتقل کیا کرتا۔

درد میں ڈوبے ہوئے ان سوگوار شاہکاروں کو نہایت سراہا گیا۔ اس کی بنائی ہوئی تصویروں کی مانگ بڑھنے لگی ـــــ وہ بھوک پیاس سے بے نیاز فن کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا ـــــ اور رات دن کی تصویر کشی نے زندگی کو ایک دم سے تھکا دیا ـــــ اسے بخار رہنے لگا۔ پھر تنہائی نے طبیعت کو مزید مضمحل کر دیا ـــــ بخار کی حدت دم توڑنے لگی۔ تب وہ پلنگ سے آ لگا۔

سکول سے کئی دن کی غیر حاضری کے باعث سکول کا ہیڈ ماسٹر شبلی

خود الوصی پہنچا ــــ یہاں وہ خالد کی حالت دیکھ کے گھبرا گیا ــــ کھانسی اُسے بے حال کر رہی تھی۔

"آپ کو تو بہت تیز بخار ہے خالد صاحب۔" اس نے گھبرا کے کہا۔ "اور کھانسی بھی بہت زیادہ ہے ــــ چلیے میں آپ کو ڈاکٹر کو دکھا لاؤں ــــ"

اور شبلیؔ اس کے انکار کے باوجود اسے اپنے ساتھ ڈاکٹر کے پاس لے گیا ــــ وہاں یہ انکشاف ہوا کہ خالد دق میں مبتلا ہے۔ شبلیؔ کی کوششوں سے اُسے جلد ہی سینے ٹوریم بھیج دیا گیا ــــ چند ماہ گزار کے خالد واپس چلا آیا ــــ لیکن روگ جو دل کو لگا تھا۔ دل سے نکل کے پھیپھڑوں پر بھی اپنا تسلّط جما چکا تھا۔ وہ تنہا درد سے تڑپتا رہتا۔ لیکن شبلی کے کہنے کے باوجود اُسے الوصی کو چھوڑنا گوارہ نہ کیا ــــ لیکن حالت زیادہ بگڑی تو بے ہوشی کی حالت میں شبلی اسے اپنے گھر لے گیا۔ جہاں اس کی چھوٹی بہن رخشندہ اور ماں نے خالد کی بھرپور تیمارداری کی ــــ شبلی کی ماں ایک پُرخلوص خاتون تھیں اور شبلی اور رخشندہ محبت کرنے والے بہن بھائی ــــ تنہائی کا درد جاتا رہا ــــ اور محبت کرنے والوں نے اُسے آہستہ آہستہ زندگی میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا ــــ لیکن جب بھی ماضی کی یاد ابھرتی تھی، درد عود کر اٹھتا تھا ــــ پھر اس نے محسوس کیا شبلی کی بہن رخشی اس کے لیے بے پناہ سنجیدہ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ دل سے اس کی تیمارداری کرتی تھی۔ اُس کی

دواؤں کا خاص طور سے خیال رکھتی تھی۔ اس کے کھانے میں خاص پرہیز کرتی تھی۔ وہ اس کا دل سے شکر گزار تھا، اُس کی عزّت کرتا تھا۔ اُس کی محبّت کا احترام کرتا تھا۔

وہ ایک افسردہ سی شام تھی —— خالد تمام دن بخار کی حدت میں پھنک رہا تھا —— شبلی سکول جا چکا تھا اور ماں کام کاج میں مصروف تھی —— رخشندہ اُسے دوا دینے کے لیے اندر داخل ہوئی —— وہ دل کو دونوں ہاتھوں سے دبائے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ یک لخت کھانسی اٹھی، وہ جھکا —— اور بہت سا سرخ خون اُبل کے سفید برتن میں جا گرا —— رخشندہ گھبرا کے اس کی طرف جُھکی تب وہ کراہ اُٹھا۔

"رخشندہ جاؤ —— چلی جاؤ —— خدا کے لیے چلی جاؤ —— میرے قریب مت آؤ۔"

اُس نے تکیے پر سر رکھ کے تھکے لہجے میں کہا —— اور تب رخشندہ نے اپنے نرم ہاتھوں سے اس کی پیشانی سہلاتے ہوئے اپنی محبّت کا اظہار کر دیا تھا۔ اُس نے بھرّائے ہوئے لہجے میں کہا:

"خالدی، میں خود کو آپ سے الگ نہیں سمجھتی —— آپ تنہا نہیں ہیں —— آپ کی رخشی کا پیار آپ کے ساتھ ہے ——" اور اس لمحے خالد کے تصوّر میں شہنا کی شبیہہ لرزنے لگی۔ جس نے کبھی محبّت کا اقرار نہیں کیا تھا —— مگر جس کی پانیوں جیسی گہرائی رکھنے والی آنکھوں میں خالد نے بارہا اپنے پیار کی لہروں کو اُٹھتے دیکھا تھا —— لیکن جس نے

والدین کی عزت کو محبوب کی محبّت پر مقدم سمجھا تھا اور جو مشرقی اقدار پر اپنے محبوب کا دل قربان کر بیٹھی تھی —— وہ حسرت سے رخشندہ کے چہرے پر دیکھتا رہ گیا۔ اُس کی سرمئی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے اور چہرے پر پیار کی تپش تھی —— خالد نے ایک گہرا سانس بھر کے آنکھیں بند کر لیں۔

"رخشو، میں اس قدر ظالم نہیں ہوں" وہ ہولے سے بڑبڑایا۔

"میں —— میں کبھی تمہارے اوپر یہ ظلم نہیں کر سکتا پیاری لڑکی —— مجھ سے دور رہنے کی کوشش کرو۔

"نہیں" رخشی سسک اُٹھی —— "میں ایسا نہیں کر سکتی —— میں آپ سے دُور نہیں رہ سکتی —— کبھی نہیں رہ سکتی"

"رخشندہ" وہ تلخی سے مسکرایا اور آنکھیں کھول کے اُس کے چہرے پر دیکھنے لگا۔ "کیا شبلی کی نظر میں مجھے گرانا چاہتی ہو؟"

"میں آپ کی زندگی کا ساتھ دینا چاہتی ہوں" وہ عزم سے بولی۔ "خواہ اس کے لیے مجھے بھیّا اور امّی کی ناراضگی کیوں نہ مول لینی پڑے"

وہ جلدی سے پلٹ کے کمرے سے نکل گئی۔

تب خالد نے سوچا —— "کیا رخشی کا پیار شہنا کی محبّت سے افضل ہے کیا میں شہنا کے جذبے پر رخشی کے جذبے کو مقدم سمجھوں" اُس نے دکھ سے سوچا۔ "کیا شہنی کی محبّت مبالغہ تھی؟ مگر نہیں ——" وہ تڑپ اٹھا —— "یہ سارہ کی معصوم اور پاکیزہ محبّت پر الزام ہے ——" وہ ایک گہرا سانس لے کے بڑبڑایا —— "سارہ کی محبت سچی تھی —— رخشی

کا پیار سچا ہے۔ ان لڑکیوں کے جذبے کبھی جھوٹے نہیں ہوتے —— اُن کے بھی جو والدین سے بغاوت کر دیتی ہیں اور اُن کے بھی جو پیار کو والدین کی عزّت پر قربان کر دیتی ہیں —— وہ سب محبتیں سچّی ہوتی ہیں۔ رخشو، تم بھی عظیم لڑکی ہو۔" وہ اپنے دوست کی بہن کے بارے میں سوچنے لگا۔ "اور میں تمہاری عظمت کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا —— میں خودغرض نہیں ہوں —— پیاری لڑکی میں شبلی کے خلوص کا جواب اور تمہاری ماں کی شفقت کا جواب —— خودغرضی سے نہیں دوں گا۔"

وہ سوچتا رہا —— اور رات گزرتی رہی —— اور رات کے پچھلے پہر وہ یکایک پلنگ سے اٹھا اور اپنا سامان سمیٹنے لگا —— پھر گرم شال کو اپنے گرد لپیٹ کے وہ کمرے سے باہر نکل آیا —— اور اس قدر خاموشی سے رخشی کا گھر چھوڑ گیا کہ بےچینی سے کروٹیں بدلتی ہوئی رخشی کی سماعت سے بھی اُس کے قدموں کی آواز نہ چھو سکی —— اور اس خاموشی کے ساتھ وہ کراچی بھی چھوڑ گیا۔

ایبٹ آباد کی طرف جانے والی رات کی گاڑی اُسے اسٹیشن پر کھڑی مل گئی اور اب گاڑی میں بیٹھا ہوا وہ اپنے اُس دوست کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ان دنوں چھٹیاں گزارنے ایبٹ آباد گیا ہوا تھا —— اُسی کے ایک خط سے معلوم ہوا تھا کہ یہاں تصویرکشی کا ایک عالمی مقابلہ منایا جا رہا تھا —— لیکن شبلی نے اسے سختی سے منع کیا تھا —— لیکن اب وہ اس کی لاعلمی میں ایبٹ آباد کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

جس وقت وہ اپنے دوست کے مکان پر پہنچا۔ وہ واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ سہیل کی بیوی فرزانہ نے ہنس کے کہا:

"ہم تو سردی بڑھنے کی وجہ سے ایبٹ آباد چھوڑ رہے ہیں اور آپ یہاں قیام کے لیے آئے ہیں۔"

"فن کار کے لیے ہر موسم یکساں ہوتا ہے بھابھی۔" خالد نے ہنس کے جواب دیا۔

تب ہی ایک بوڑھی خاتون گرم کپڑوں میں لدی ہوئی مکان میں داخل ہوئیں ——

"یہ اماں آپ کا خیال رکھیں گی۔" فرزانہ نے کہا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ ہم نہ رک سکے۔"

سہیل نے بھی اُس کے ساتھ معذرت کی اور دونوں رخصت ہو گئے۔

اور اب خالد —— یہاں ایبٹ آباد کے پہاڑی علاقے پر اپنے دوست کے مکان میں، اپنے ادھورے شاہکار کی تکمیل میں منہمک تھا کہ قدرت نے ایک اور ظلم کیا —— شاہکار کی بربادی اس کی روح میں شگاف کر گئی —— یہ شاہکار جو اُس کی محروم زندگی کا عکاس تھا اور جس کی تکمیل پر اُس نے اپنے ذہن کی تمام تر صلاحیتیں صرف کی تھیں اور جو قدرت کے ذرا سے اشارے پر سیاہی میں ڈوب گیا تھا —— پھر اس غم نے ابھی سنبھلنے بھی نہ دیا تھا کہ شہنائی کی آواز سارہ کی یاد بن

کے دل میں اترتی چلی گئی —— اور اُتر کے ایک درد بن گئی تھی ۔ سینے میں درد بڑھتا گیا ۔ اپنی ذات سے لاپروائی رنگ لا رہی تھی —— برفانی موسم میں ہلکا پھلکا لباس اور تیر کی طرح کھال میں پیوست ہوتی ہوئی سرد ہوائیں —— بے دم ہو کے پلنگ پر گر گیا —— تب ماضی میں اُتر کے اُس کی روح اس قدر زخمی ہوئی کہ وہ تڑپ اٹھا ۔

کچھ دیر پہلے بوڑھی خاتون حلیمہ بائی جو اکثر اس کی تنہائی کے باعث اس کی ضروریات معلوم کرنے مکان میں آ جایا کرتی تھی ۔ آج بھی اُسے دوا دے کے گئی تھی —— کھڑکیاں دروازے بند کر کے آتشدان جلا گئی تھی ۔ گرم کافی اور ہمدردانہ گفتگو نے خالد کے دل کو خاصی ڈھارس دی تھی —— لیکن حلیمہ بائی کے جانے کے بعد وہ اب پھر تڑپ رہا تھا ۔ کسی کا درد انگیز خیال اُس کی روح کو سُلگا رہا تھا ۔

(۱۰۹)

تیرے احساس کی پھولوں بھری پگڈنڈی پر
ایک ٹوٹا ہوا پتّہ بھی سُلگتا ہو گا

اور وہ بھی سلگ رہی تھی ــــ پھولوں کی سیج ــــ جو شعلوں کی طرح دہک رہی تھی۔ اسی سیج کی تپش انگیز خوشبو اُس کی روح کو بھی سُلگا رہی تھی اور پھر درد سے تڑپ کے ــــ تکلیف سے بے قرار ہو کے وہ مسہری سے نیچے اتر آئی ــــ سامنے دریچے پر کھچا ہوا دبیز پردہ باہر کی ہوا کے زور سے ہولے ہولے لرز رہا تھا ــــ جیسے اُس کا معصوم من جہاں آنے والے کے لیے کوئی جذبات نہیں تھے کوئی اُمنگ نہیں تھی۔ اپنے محبوب کی تڑپتی ہوئی سسکتی ہوئی ایک تصویر تھی ــــ جسے وہ باوجود کوشش کے جدا نہیں کر سکتی تھی ــــ پھر جدا کرتی بھی کیسے، خیال جو ذہن میں بسا تھا ــــ جذبہ جو لہو کے ساتھ رگوں میں دوڑ رہا تھا ــــ جان جائے بغیر کیسے الگ ہو سکتا تھا۔ "لیکن یہ جان، کسی کی امانت ہے شہنا" زخمی دل کراہا۔ "ماضی کو بھول جاؤ، اور حال کو دیکھو ــــ خود کو اس کے لیے تیار کرو ــــ وہ بے قصور ہے، اُسے ناکردہ جرم کی سزا تو نہ دو ــــ وہ بے گناہ ہے شہنا" وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

"اسلم حمید کو پا کے تم خالد کا دُکھ بھی بھُول جاؤ گی شہنو" اُسے اپنی

ماں کے الفاظ یاد آنے لگے ۔" وہ جو تمہارا شوہر ہو گا ـــــ تمہارا مجازی خدا ـــــ"
اور شہنا ایک عزم کے ساتھ ہولے ہولے سیج کی طرف بڑھ آئی ـــــ سُرخ زرتار
گھونگھٹ چہرے پر سرکا کے اس نے آنے والے سے متعلق سوچا ـــــ مگر
خیالوں میں کوئی اور در آیا ـــــ وہی اُس کا محبوب اپنی ساحرانہ چال کے ساتھ
اور وہ سحرزدہ سی بیٹھی رہی ـــــ مگر اُسی لمحے کوئی اور آواز اُس کے محبوب
کے قدموں کی آہٹ پر غالب آنے لگی ـــــ اُس کی سماعت نے کسی کے
بھاری قدموں کی آواز سُنی، قریب اور قریب، وہ ساکت بیٹھی رہی ـــــ
پھر دو ہاتھوں نے جن کی انگلیوں میں بیش قیمت انگوٹھیاں تھیں ـــــ اُس
کا سرخ زرتار گھونگھٹ الٹ دیا ـــــ دلہن کے سحرکیش حُسن نے آنے والے کو
کئی لمحوں کے لیے مبہوت کر دیا ـــــ پھر جذبات میں ڈوبی ہوئی گھمبیر آواز اُس
کی سماعت سے ٹکرائی ـــــ

"آپ کس قدر حسین ہیں عروس من ـــــ ذرا ادھر تو نگاہ کریں ۔"
آگے جُھک کے اس نے ہولے سے سرگوشی کی ۔" ہم آپ کے اپنے ہیں،
کوئی غیر تو نہیں ـــــ" اور دلہن کی پلکیں لرز کے اٹھ گئیں ـــــ کسی کے
پُرشوق چہرے سے ٹکرائیں اور لرزتے ہونٹوں سے ایک تیز چیخ لپک کے
نکلی ـــــ آنے والا گھونگھٹ چھوڑ کے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا ـــــ اور
گھونگھٹ پلٹ کے وہ بے اختیار اُس کی طرف بڑھ آئی ـــــ "خالدی!"
اس کا لہجہ والہانہ تھا ۔

"خالدی!" اس نے تعجب سے اپنی دلہن کو دیکھا ۔ دل میں ایک ٹیس

سی اُٹھی۔ "وہ کون ہے؟" اس نے سوچا۔

"خالد — تم — تم" وہ بے قرار ہو کے پھر اُس کی جانب بڑھی۔

تب اُس نے کہا:

"میں خالد نہیں ہوں —" اُس کے لہجے میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔ "میں ڈاکٹر اسلم ہوں — اسلم حمید۔"

"نہیں — تم خالد ہو۔" وہ مُصر تھی۔

"میں خالد نہیں ہوں۔" اُس نے اسی لہجے میں دُہرایا۔ "غور سے دیکھو، میں کون ہوں؟"

تب سارہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ وہ انگ انگ میں بستا تھا۔ ذہن میں، دل میں، آنکھوں میں ہر طرف وہ تھا — ہر جانب وہ تھا۔ تو — تو کیا وہ —

اُس نے آنکھوں کو مَل کے ایک بار پھر سامنے موجود شخص کو دیکھا۔ وہ بلاشبہ خالد تھا وہی چاند کی طرح دمکتا ہوا رنگ — گھرے سیاہ بالوں کا سپید محراب دار پیشانی پر خوبصورت جھکاؤ، گھنی سیاہ ابروؤں کے نیچے گہری آنکھیں، ستواں ناک — اور تراشیدہ لب جو خفیف سا کھلے ہوئے تھے۔ سفید دانت پیازی لبوں سے جھانک رہے تھے — کس قدر معصومیت تھی اُس کے چہرے پر — اور یہی وہ رُوپ تھا جو پہلی بار اس کی زندگی میں آیا تھا۔

"خالد — خالد!" وہ سسک کے بولی۔ "کیوں مجھے تڑپا رہے

ہو — خدا کے لیے اب تو یہ بہروپ ختم کرو — مجھے ڈاکٹر اسلم نہیں چاہیے:
مجھے اپنے خالد سے پیار ہے — خدا کے لیے اپنے رُوپ میں آجاؤ —
خالد وصی کے رُوپ میں ": وہ دوڑ کے اس سے لپٹ گئی — پھُوٹ پھُوٹ
کے رونے لگی۔

" مجھے اُمید تھی خالدی — تم میری زندگی سے نہیں جا سکتے —
ایک دن چپکے سے چلے آؤ گے — مگر یہ سب کیسے ہوگیا — تم —
تم خاموش کیوں کھڑے ہو — " وہ سر اٹھا کے بولی — " کچھ بولتے
کیوں نہیں "

اور وہ لب بھینچے دوسری طرف دیکھتا رہا —

" آہ ": وہ ہولے سے بڑبڑائی — " آج بھی ناز دکھا رہے ہو، اس
قدر سنگدل تو نہ بنو — کیا اتنے عرصے کی تڑپ کافی نہیں — "

" آ — آپ پاگل ہیں — دیوانی ہیں — " اسلم نے یک لخت
اُسے بازوؤں سے تھام کے خود سے الگ کر دیا — " دل کی آنکھیں بند
کریں — پھر دیکھیں تب آپ جانیں گی کہ ہم کون ہیں — " اُس نے
غصے سے کہا — " اگر آپ کا محبوب خالد وصی ہے تو آپ جان لیں کہ
مشابہت رکھنے کے باوجود ڈاکٹر اسلم حمید اور خالد وصی دو الگ شخص ہیں۔
آپ کو آپ کا محبوب مبارک — اُس کا خیال مبارک، ہم جا رہے ہیں ":
وہ ایک جھٹکے سے پلٹا۔

" ٹھہریے ": وہ تڑپ کے آگے بڑھی — ایک جھٹکے نے ذہن کو

شفاف کر دیا تھا ـــ وہ ڈاکٹر اسلم کو پہچان گئی ۔ "مم ـــ مجھے معاف کر دیں" وہ ہکلائی ـــ "آپ میرے سرتاج ہیں ـــ میرے مجازی خدا ـــ میرے سرتاج ـــ میرے سرتاج ـــ" وہ اُس کے آگے جھک گئی ۔ "میں عقل کا دامن کھو بیٹھی تھی ـــ بخدا ـــ بخدا آپ بالکل وہی ہیں ـــ خدارا مجھے معاف کر دیں"

"ہم آپ کو معاف نہیں کر سکتے" وہ کرب سے بولا ۔ "آپ سارہ صاحبہ ـــ آپ دھوکا باز ہیں ـــ آپ فریبی ہیں ـــ ہاں آپ نے ہمیں فریب دیا ہے ـــ ہمارے جذبات کا، ہمارے ارمانوں کا خون کیا ہے ـــ آپ ہمارے امنگوں بھرے دل کی قاتل ہیں ـــ ہم آپ کو معاف نہیں کر سکتے"

"مجھے جان سے مار دیجیے ـــ مجھے پھانسی دے دیجیے ـــ مگر خدا کے لیے مجھے معاف کر دیجیے" وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی ۔ رو رو کے اپنی خطا معاف کروا رہی تھی ـــ مگر ڈاکٹر اسلم بُری طرح دہک رہا تھا، اُس کی آنکھیں سرخ ہو چلی تھیں ـــ وہ آگے بڑھا اور اُسے بے دردی سے دھکیلتا ہوا کمرے سے نکل گیا ۔

سارہ نے قالین پر بیٹھ کے گھٹنوں میں سر دے لیا اور سسک سسک کے رونے لگی ـــ باہر سرد ہوائیں مسلسل چیخ رہی تھیں ۔

۱۸

زندگی کے حسین ترکش میں

کتنے بے رحم تیر ہوتے ہیں

اور ـــــ دو دلوں کی امنگوں بھری ـــــ محروم رات بیت گئی ـــــ سرد فضاؤں میں سر گرداں رہنے کے بعد ڈاکٹر اسلم حمید رات کے پچھلے پہر کلب کی شور مچاتی ہوئی رنگین فضا میں جا پہنچا، جہاں ہر فکر سے آزاد کھنکھناتے ہوئے قہقہے فضاؤں میں بکھر رہے تھے۔ جام ٹکرا رہے تھے۔ فکر، پریشانیاں دکھ اور درد ـــــ شراب میں ڈوب رہا تھا ـــــ اسلم نے بھی ایک کرسی پر گر کے بیرے کو شیمپین کا آرڈر دیا ـــــ بیرے نے اس کے حکم کی تعمیل کی ـــــ وہ جام پر جام چڑھاتا رہا، مگر من کی آگ بجھتی نہ تھی، پیاس بھڑک اٹھی تھی۔ تڑپ کئی گنا بڑھ گئی تھی ـــــ وہ تڑپ جو اس کے جیون ساتھی نے سفر کے پہلے ہی دن چرکا دے کے اُسے بخشی تھی۔ جس کی محبت پر اس کی زندگی کا دارو مدار تھا، اسی میں کھوٹ تھا اور جو کسی اور کی ملکیت ہو جس کا دل، جس کا ذہن، جس کی رُوح کسی اور کے خیال سے سُلگ رہی ہو ـــــ اُس کے دامن میں وہ زندگی کا سرور نہیں پا سکتا تھا۔ وہ سکون اُسے اُس دامن میں نہیں مل سکتا ـــــ جس کی آرزو میں اس نے پہلی رات اپنی دلہن کا گھونگھٹ اُلٹا تھا اور جو وہاں نہیں مل سکتا تھا، وہ پانے کے لیے ڈاکٹر اسلم حمید یہاں آیا تھا ـــــ اس عورت کے پاس جو سرور و قرار مول بیچتی

تھی۔ اپنی اس دلہن کو چھوڑ کے جو اپنا تن من وار دینے کو اس کے قدموں میں جھک آئی تھی مگر جس کے دل میں کسی اور کی تصویر تھی، کسی اور کا خیال تھا ـــــ اور جس دل کو اپنانا ـــــ اسلم نے گوارا نہیں کیا تھا ـــــ وہ جو اس کی منکوحہ تھی، صرف اسی کی تھی جو اُسے مجازی خدا کہتی تھی ـــــ مگر جس کے معصوم لبوں پر غلطی سے اس کے دل کا خیال بول اٹھا تھا پھر وہ اپنی اس غلطی پر نادم بھی تھی ـــــ معافی کی خواستگار تھی۔ پچھتا کے اس کے آگے جھکی تھی مگر اسلم اسے ٹھکرا کے یہاں چلا آیا تھا ـــــ سکون پانے کے لیے اُس کے پاس جس کا دل کسی ایک کا بھی نہیں تھا ـــــ جس کی آغوش ہر ایک کے لیے وا تھی جو سرِ عام بکتی تھی، سرِ عام خریدی جاتی تھی۔ یہاں وہ سکون پانے کے لیے آیا تھا ـــــ بے وقوف مرد ـــــ جھوٹی عزت کا پجاری اپنی ذات کو فریب دینے والا ـــــ بے وقوف مرد ـــــ شیمپئین کے تیز نشے میں ڈوب کے اس نے بیرے کو آواز دی۔ پھر اُس کا انتظار کیے بغیر کلب کے اندرونی حصّے کی طرف بڑھ گیا ـــــ جہاں سوسائٹی کی مشہور حسینہ نازنین جمال ـــــ آنے والے کی منتظر تھی۔ کلب کے ساتھی اُسے حیرت سے دیکھتے رہے اور وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھتا رہا۔

اور رات یہاں بھی بیت گئی تھی۔ بند کمرے میں اشک بہاتی ہوئی بھیگی بھیگی رات ـــــ سارہ نے تمام زیورات اتار کے لباس تبدیل کیا اور دروازہ کھول کے باہر آ گئی ـــــ کچھ مہمان عورتیں سامنے بالکونی میں کھڑی تھیں وہ

گھبرا کے اندر پلٹ آئی ـــ اور کچھ ہی دیر بعد مسز ملک بہو کا حال پوچھنے آئیں ـــ یہاں ایک سہاگن کو یوں اجڑا اجڑا دیکھ کے ان کا کلیجہ دھک سے رہ گیا :

"اسلم کہاں ہے ؟" انہوں نے بے تابی سے پوچھا -

وہ خاموش رہی، کچھ بھی نہ بولی ـــ خالی خالی آنکھوں سے سامنے کھڑی خاتون کو دیکھتی رہی وہ لرزتے قدموں سے آگے بڑھ آئیں بہو کے سر پر ہاتھ رکھا ـــ

"اسلم کہاں ہے بٹیا ؟" کانپتے لہجے میں بولیں -

تب سارہ ان کے سینے سے لگ کے بے اختیار رو دی ـــ اور جب اُس کا جی ہلکا ہوا تو اُسے بتایا کہ وہ رات ہی کو کہیں چلا گیا تھا ـــ مسز ملک حیرت زدہ رہ گئیں ـــ "کس قدر مسرور تھا، وہ اس لڑکی کو اپنا کے ـــ" انہوں نے سوچا - "صرف ایک بار کسی تقریب میں دیکھ کے وہ اس کے لیے کتنا دیوانہ ہوا تھا اور وہ جنہیں برسوں سے بہو لانے کا ارمان تھا - چٹ پٹ بیاہ کر بیٹھیں - صاحبِ جائیداد ہونے کے علاوہ اسلم ایم بی بی ایس بھی تھا ـــ لاکھوں کا کاروبار ملک میں پھیلا ہوا تھا. ریاض احمد اور اس کی بیوی بلا کسی ردّو کد راضی ہو گئے ـــ اسلم کی مسرت کی انتہا نہ رہی ـــ اور اب ـــ وہ یوں نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کے کہیں چلا گیا تھا ـــ انہوں نے بڑی گہری نگاہوں سے اپنی حسین بہو کو دیکھا اور سارہ ان نگاہوں کا مطلب جان کے لرز گئی . یک لخت

سسک اٹھی۔

"امّی جان ـــــ میں بے قصور ہوں۔" اس نے ہولے سے کہا۔"انہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" مسز ملک نے نگاہیں جھکالیں۔

"میں نے اُسے بہت لاڈ سے پرورش کیا ہے بیٹیا۔" وہ آہستہ سے بولیں۔"اپنی زندگی میں اس نے کبھی کوئی تکلیف نہیں دیکھی ـــــ جو چاہا وہ پایا ـــــ وہ بیاہ پر راضی نہیں ہوتا تھا ـــــ تمہیں ایک نظر دیکھ کے پانے کے لیے بے چین ہوگیا ـــــ اُسے امید تھی تم اسے مل جاؤ گی لیکن شاید ـــــ وہ تمہیں پا نہیں سکا ـــــ وہ بہت جذباتی ہے میری بچّی۔" انہوں نے ایک گہرا سانس بھر کے کہا۔"لیکن اگر تم بے قصور ہو تو بے فکر رہو ـــــ میں اسے راہ پر لانے کی کوشش کروں گی۔"

لیکن مسز ملک اُسے راہ پر نہ لاسکیں ـــــ وہ راہ سے بے راہ ہوا اور پستیوں میں اترتا چلا گیا ـــــ کثرتِ مے نوشی نے اس کی شخصیّت کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ اُسے شہنا کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ تھا ـــــ اپنے ہی کمرے میں ناشتا سے فارغ ہو کے وہ باہر نکل جاتا پھر رات گئے نشے میں مدہوش واپس لوٹتا ـــــ بعض اوقات کئی کئی دن گھر سے غائب رہتا ـــــ مسز ملک خاموشی سے دیکھتی رہیں ـــــ استفسار بھی کرتیں تو کیونکہ نشے میں مدہوش ذہن میں سمجھنے کی صلاحیّت بھی مفقود تھی ـــــ سارہ اجنبیوں کی طرح وہاں دن بسر کر رہی تھی ـــــ شوہر کا وہ رُوپ جس میں پہلی رات محبوب کی شبیہہ پا کے وہ بے اختیار اس کا نام پکار اٹھی تھی۔ اُسے پھر کبھی

نظر نہیں آیا - لڑکھڑاتے قدم ــــ بہکی بہکی سرخ آنکھیں ــــ اور چنگھاڑتی ہوئی آواز - اسلم کی شخصیت مسخ ہو کے رہ گئی تھی ــــ مسز ملک خون کے آنسو روئیں ــــ دبے لفظوں کبھی تنبیہہ بھی کی تو وہ چراغ پا ہو گیا ــــ ایک دن خلافِ توقع وہ سرِ شام ہی گھر آگیا ــــ کچھ ہوش میں بھی نظر آتا تھا ــــ مسز ملک اس کے پیچھے ہی اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ اندر داخل ہو کے انہوں نے دیکھا - وہ جوتوں سمیت بیڈ پر دراز تھا ۔

" یہ ــــ یہ تم کس راہ جا رہے ہو میرے بچے ۔" انہوں نے شفقت سے کہا ۔" کیوں اپنی زندگی تباہ کر رہے ہو ــــ اور کیوں ایک معصوم کی زندگی سے کھیل رہے ہو ۔"

" وہ معصوم نہیں ہے امی ــــ" اسلم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

" یہی میری زندگی کا روگ ہے جسے آپ یا وہ کبھی دور نہیں کر سکتے ۔"

" تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے بیٹیا ــــ وہ بے قصور ہے ۔" انہوں نے آہستہ سے کہا ۔ " اگر اُس سے تمہیں کوئی شکایت بھی ہے تو یہ تمہاری ماں کی درخواست ہے کہ اسے معاف کر دو ــــ مرد کا دل وسیع ہونا چاہیے ۔ عورت بہت مظلوم ہوتی ہے میرے بچے ۔"

" امی ۔" وہ چیخ اٹھا ۔" اُسے مظلوم نہ کہیں ــــ میں کہتا ہوں، میں مظلوم ہوں ۔" اس کی آواز دھیمی ہو گئی ــــ " ہاں، امی آپ کا بیٹا مظلوم ہے اس نے آپ کے بیٹے پر ظلم کیا ہے، مجھے مجبور نہ کیجیے کہ میں اُس فریبی عورت کی صورت بھی نگاہوں میں لاؤں ۔"

"ٹھنڈے دل سے غور کرو بیٹا"۔ مسز ملک نے نرم آواز میں کہا۔"وہ تمہارے نکاح میں آگئی ہے، جیسی بھی ہے تمہیں قبول کرنا ہے ــــ پھر میں اسے جانتی ہوں وہ فطرت کی بہت اچھی ہے"۔

"مجھے اس کی فطرت سے کوئی مطلب نہیں ــــ" وہ تیزی سے اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "اسے واپس بھیج دیجیے امّی، مجھے اس کا ساتھ گوارا نہیں. اگر آپ نے مجبور کیا تو میں کہیں چلا جاؤں گا۔"

"کہاں چلا جائے گا ؟" ان کے ماتھے پر شکنیں آگئیں۔ "کیوں چلا جائے گا۔ کیا اسی لیے بیاہ کے لایا تھا اُسے ــــ نہیں میں شہنا کو کبھی واپس نہیں بھیج سکتی"۔

"تو میں یہ گھر چھوڑ دوں گا ــــ اس گھر میں وہ لڑکی رہے گی یا میں ــــ جو فیصلہ آپ نے کرنا ہے ابھی کر لیں"۔

"تو نہیں سمجھتا لڑکے ــــ عورت کی عزت کیا ہے"۔ ان کی آواز میں ایک عزم آگیا۔ "چند دن کی بیاہی دلہن کو تو عمر بھر کا داغ دینا چاہتا ہے ــــ جو تیری ماں کسی سے مانگ کے لائی تھی ــــ تو چاہتا ہے، اُسے واپس لوٹا کے شرمندہ ہو ــــ نہیں مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ جا چلا جا، اس وقت تیری عقل پر پردہ پڑا ہے ــــ اٹھ جائے تو چلے آنا"۔

"میں جا رہا ہوں"۔ وہ تیزی سے بولا۔ "اور جب مجھے معلوم ہو جائے گا کہ آپ نے اُسے واپس بھیج دیا ہے تو میں لوٹ آؤں گا؛ ورنہ

آپ سمجھ لیں، آپ نے بیٹے کو عمر بھر کے لیے کھو دیا۔"

اسلم تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا ـــــ مسز ملک چند لمحے ساکت کھڑی رہ گئیں۔ پھر بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ کمرے سے باہر آئیں تو آنسوؤں کی دھند میں انہوں نے بھیگی بھیگی سارہ کو نیچے بالکونی میں کھڑے دیکھا۔ اُس نے ہلکے آسمانی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور سیاہ بال شانوں پر بکھر گئے تھے ـــــ سامنے پہاڑی راہ پر اسلم کی براؤن اوپل کار تیزی سے دُور ہو رہی تھی ـــــ وہ شکستہ قدموں سے سارہ کی طرف بڑھ آئیں۔

"مرد بہت ظالم ہوتا ہے میری بچّی۔" انہوں نے بھاری لہجے میں کہا۔" وہ دیکھو ماں کا دل بھی توڑ کے چلا گیا ـــــ کہتا ہے اب نہیں لوٹوں گا۔" سارہ پلٹ کے ان سے لپٹ گئی۔

"امّی، میں مجرم ہوں ـــــ مجھے سزا دیجیے ـــــ امّی، مجھے سزا دیجیے۔" اس نے رو کے کہا۔

"نہیں میری بچّی ـــــ" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔" وہ تیرا مجرم ہے اور میں تیری گنہگار ـــــ میں تجھے خوشیوں کے ہنڈولے میں بھر کے لائی تھی۔ میری بچّی اور کچھ بھی نہ دے سکی تو ہر خوشی سے محروم رہی ـــــ مجھے معاف کر دے میری بچّی۔"

"امّی ـــــ" وہ سسک اٹھی۔" ایسا نہ کہیں ـــــ امّی ایسا نہ کہیں۔"

"میں نے اسے شہزادوں کی طرح پالا ہے۔" وہ ہولے سے بڑبڑائیں۔

"اس کی ہر جائز و ناجائز ضد پوری کی ہے مگر میں عورت پر ظلم نہیں کروں گی۔" وہ ہولے ہولے کہہ رہی تھیں۔

پھر انہوں نے یکایک دل پر ہاتھ رکھا اور آنکھیں بند کر کے جھول گئیں۔ سارہ نے فوراً انہیں بازوؤں پر سنبھال لیا۔ سمجھ دار ملازم کوئی تاخیر کیے بغیر ڈاکٹر کو فون کرنے لگا۔

ڈاکٹر واجد خورشید مسز ملک کا باقاعدہ معالج ہونے کے ساتھ ساتھ اسلم کا قریبی دوست بھی تھا۔ اُس نے سارہ کو بتایا کہ مسز ملک کو دل کے دورے اکثر و بیشتر پڑتے رہتے ہیں اور جب اُسے معلوم ہوا کہ اسلم کے چلے جانے کے باعث اُن کی حالت بگڑی ہے تو وہ بہت پریشان ہو گیا۔

"سمجھ میں نہیں آتا بھابھی ——" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ کیوں اچانک ہی غلط راہوں کی طرف چلا گیا۔ وہ میرے تعلیمی دور کا ساتھی ہے اور آپ یقین کریں وہ ایک بچے کی طرح معصوم تھا۔ لیکن اب وہ بُری سوسائٹی میں اس قدر مدغم ہوا ہے کہ مجھے پہچاننے کا روادار نہیں۔ اُسے ہر اس شخص سے بیر ہے جو اسے سیدھی راہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے —— اور میرا خیال ہے اسی لیے وہ آنٹی سے ناراض ہو کے چلا گیا ہے۔"

سارہ خاموشی سے سر جھکائے سُنتی رہی۔

"آپ فکر نہ کریں بھابھی۔" وہ پھر بولا۔ "میں اُسے تلاش کرنے

کی ہر ممکن کوشش کروں گا — آخر وہ جائے گا کہاں؟"

سارہ اُسے چھوڑنے گیٹ تک آئی۔

"آپ کا دل گھبرایا کرے تو شاہانہ کے پاس آجایا کریں —" ڈاکٹر واجد نے مسکرا کے کہا۔ "یا پھر اُسے بلا لیا کریں۔"

سارہ نے اثبات میں سر ہلایا پھر آہستہ سے بولی۔

"بھابھی کو میری طرف سے پوچھ لیجیے گا۔"

"جی بہتر —" واجد نے کہا اور ہاتھ ہلا کے گاڑی سٹارٹ کردی۔

۱۸

چلا گیا وہ اُسے کیا خبر کہ اُس کے لیے
کسی کی آنکھ بہت دیر شبنمی سی رہی

وہ ایک گرم اور خاموش دوپہر تھی۔ شہناتنہا اور اداس اپنے بیڈ پر ساکت لیٹی اوپر تک رہی تھی۔ سیلنگ فین کے ساتھ ساتھ اس کے خیالات بھی چکر لے رہے تھے۔ اُسے پچھلے برس کی وہی خاموش اور گرم دوپہر یاد آ گئی تھی جس میں وہ اتفاقاً ہی خالد وصی سے مل گئی تھی ــــ اس وقت جب کہ اُن کے درمیان پیدا ہونے والے تمام رشتوں کو توڑ دیا گیا تھا ــــ لیکن وہ رشتہ جو روحوں کے درمیان قائم ہوا تھا اُس کی سچائی سے دنیا والے بے خبر تھے اور یہ روحانی کشش ہی تھی کہ وہ اتفاقاً مل گئے۔ لیکن کیسی تشنہ سی ملاقات تھی وہ ــــ وہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ بازار کچھ خریدنے گئی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے، بازار میں گھومنے پھرنے سے حالت خاصی بُری ہو گئی۔ نزہت نے کہا:

"چلو میری خالہ کا گھر یہاں سے نزدیک پڑتا ہے۔ کچھ دیر آرام کر کے ٹھنڈا وغیرہ پی کے چلیں گے۔"

نزہت کی خالہ کے سرسبز درختوں اور بیلوں میں گھرے ہوئے بنگلے نے اُن کے تھکے ہوئے اعصاب کو بڑا ٹھنڈا سا احساس بخشا۔ دونوں خاموشی سے اندر چلی آئیں۔ تب ہی اس نے دیکھا کوئی شخص ان کی سمت آ رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک ٹیس سی اُٹھی ــ وہ وحید تھا خالد کا گہرا دوست ــــ اسے ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہوا اُسے دیکھ

کے ـــــ ایسے حالات میں محبوب سے تعلق رکھنے والا ہر شخص پیارا ہو جاتا ہے۔

"آپ، وحید بھائی ـــــ آپ یہاں کہاں؟" وہ بے ساختہ اس کے قریب چلی گئی۔

"تو آپ نزہت کی دوست ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"جی ـــــ خالد کیسے ہیں؟" اس نے بلا کسی تاخیر کے پوچھا۔

"آپ کو خبر نہیں۔" وحید اداس ہو گیا پھر بولا۔" کیا بتاؤں آپ کو، وہ تو دنیا سے بالکل ہی کٹ کے رہ گیا ہے۔ کبھی کبھار آجاتا ہے۔ آج صبح بھی آیا تھا، طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں نے روک لیا۔"

"کیا وہ یہیں ہیں؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں سو رہا ہے۔" وحید نے آہستہ سے کہا۔

نزہت جو اس عرصے میں چپ تھی مسکرا کے بولی۔

آپ کے کون ہیں خالد بھائی؟"

تب وہ چونک گئی، سنبھل کے بولی:

"میری بچپن کی دوست تھی زیب، وہ اب بیاہ کے پنڈی چلی گئی ہے، اُن کے بھائی ہیں۔ عرصے سے ان لوگوں کی خبر نہیں ملی تھی۔"

"آؤ اندر آؤ۔" وحید نے کہا۔

"خالہ جان اور ریحانہ نظر نہیں آرہیں؟" نزہت نے پوچھا۔

"سو رہی ہیں شاید۔" اس نے کہا اور انہیں لے کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ جہاں ایک صوفے پر وہ بے ترتیب سا سو رہا تھا۔ ثمینا کا دل عجیب سا ہونے لگا۔

وہ کچھ بیمار لگ رہا تھا اور نیند نے اس کی معصومیت میں اضافہ کر دیا تھا. لیکن اُس کے زرد چہرے پر تھکن کے آثار تھے جیسے سپنوں کی دنیا میں بھی وہ سکون سے محروم ہو —— شہنا کا دل دکھنے لگا —— کتنی ہی دیر وہ لوگ بیٹھے رہے۔ وحید نے خود انہیں اسکواش بنا کے دیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے شہنا کی نظریں بار بار بھٹک کے سوتے ہوئے خالد پر جا رکتی تھیں۔ ہلکے رنگ کی پینٹ اور سفید کرتے میں، جس کے گلے کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ بے ترتیب سا سوتا ہوا وہ کیسا معصوم اور پیارا لگ رہا تھا. پھر شہنا کی رکی ہوئی نظروں نے محسوس کیا جیسے وہ کوئی خوش کن سا سپنا دیکھ رہا ہو۔ اس کے لبوں پر مدھم سی مسکان تھی اور پھر یک لخت وہ سپنا ٹوٹ گیا۔ خالد کی پلکیں لرزیں اور اٹھ گئیں اور پھر جیسے جھپکنا بھول گئیں۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی شہنا اس کے خوابوں سے اُتر کے یہاں حقیقت میں اُس کے اس قدر قریب آ گئی ہے۔ اس کی نظریں شہنا کے نقوش میں اُلجھی ہوئی تھیں اور وہ مدہوش سا تھا۔

"کیسے ہیں آپ؟" شہنا کی مدھم آواز اسے بے ہوشی کی دنیا سے باہر کھینچ لائی۔ وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ گہرا سانس کھینچ کے نظر جھکا لی۔ آہستہ سے بولا۔

"ٹھیک ہوں!"

کچھ دیر کمرے کی فضا خاموشی سے منجمد رہی۔ پھر خالد اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ بالوں کو ایک ہاتھ سے درست کیا۔ پھر کمرے سے ملحقہ باتھ روم میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو حالت قدرے درست تھی۔ شہنا کی طرف دیکھے بنا بولا۔

"اچھا اب میں چلوں گا۔"

"کیوں؟" وحید اس کی دلی کیفیت سے واقف تھا پھر بھی پوچھا۔ "شہنا سے

باتیں کرو کچھ ـــــ دیکھو آج وہ ہماری مہمان بن کے آئی ہے ۔"

"مجھے کام تھا دراصل، شبلی کو ٹائم دے رکھا تھا ۔" اس کی نظر اب بھی جھکی ہوئی تھی ۔

"اچھا ـــــ" وحید نے ایک ہلکا سا سانس چھوڑ کے کہا ۔ "پھر تو مجھے روکنا نہیں چاہیے ۔"

اور پھر وہ چلا گیا ـــــ شہنا کے دل پر پاؤں رکھتا ہوا ـــــ اور وہ دل سے اُبھرنے والے خون کو آنکھوں میں آنے سے روکتی رہی ۔ تب ہی ریحانہ، نزہت کی خالہ زاد بہن آگئی ۔ کافی دیر کی گفتگو اور چائے پانی کے بعد ریحانہ شہنا سے خاصی بے تکلف ہو چکی تھی اور یوں چند دن بعد ہونے والی وحید کے چھوٹے بھائی کی رسم سالگرہ میں ـــــ ریحانہ نے اُسے بھی مدعو کیا ـــــ وہ اُن دونوں کو گیٹ تک چھوڑنے آئی ـــــ اور تقریب میں شامل ہونے کا اُس سے وعدہ بھی لیا ۔

اور اسی خاموش دوپہر میں ـــــ خالد بھی کہیں پیچھے، اُسی کے خیال میں تھا ۔ اُس روز شہنا سے مل کے اور اسے دیکھ کے اس کے زخم کی کسک میں اضافہ ہو گیا تھا ۔ رات اپنے تنہا اور اُجڑے سے گھر کے ویران در و دیوار کو خالی آنکھوں سے تک رہا تھا ۔ اور یہ ویرانی اس نے صرف شہنا کے حصول کے لیے اپنے مرحوم باپ کو تکلیف پہنچا کے قبول کی تھی ـــــ مگر وہ تلخ سی ہنسی ہنس دیا ـــــ رات گزرتی جاتی تھی ۔ لیکن نیند کا کوئی پتا نہ تھا ـــــ اور پھر ان کھلی آنکھوں میں کچھ تلخ یادوں کی دھول سی بھر گئی ـــــ اور اس نے پلکوں کے اندر خمار محسوس ہونے پر آنکھوں کو میچ لیا ـــــ

اُن دنوں جب زیب پنڈی روانہ ہو چکی تھی۔ وہ پھر اپنے اجڑے ہوئے گھر میں تنہا رہ گیا تھا۔ شہنا کے دیئے گئے کربناک زخموں سے تھکا تھکا سا ــــــ وہ شام بڑی اداس اور بوجھل تھی۔ وہ افسردہ سا اپنی بالکونی میں جھکا ہوا تھا کہ غوری صاحب کی کار گیٹ پر رُکی وہ سب کچھ بھول کے یوں چونک کے سیدھا ہوا جیسے اب شہنا پٹ کھول کے نیچے اتر آئے گی ــــــ اور پھر ــــــ خالد پھیلی پھیلی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ پٹ کھل گیا تھا ــــــ اترنے والی نے نیلے رنگ کی شلوار اور سیاہ چپل پہنی ہوئی تھی اور وہ نیچے اتر آئی۔ تب خالد ایک گہرا سانس بھر کے سیدھا ہو گیا۔ وہ شہنا کی ملازمہ زبیدہ تھی۔ اس کے ہاتھوں میں کچھ بنڈل تھے۔ خالد نے اُلجھی اُلجھی نظروں سے انہیں دیکھا اور پلٹ کے سیڑھیاں اتر آیا۔

زبیدہ نے جو اندر آچکی تھی اُسے سلام کیا، آہستہ سے بولی۔

"یہ بیگم صاحبہ نے بھیجا ہے، منگنی کا سامان ہے۔"

خالد کا دل جیسے کسی نے مسل ڈالا۔ وہ موہوم سی امید جو کبھی کبھی دل کو ڈھارس بندھاتی تھی یک لخت ٹوٹ گئی۔ وہ کتنی ہی دیر چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا اُسے بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔

"بیگم صاحبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی؛ ورنہ وہ خود آتیں۔" زبیدہ نے بتایا۔

"تمہارے ساتھ کون آیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"صاحب کے ایک دوست کا بیٹا، باہر گاڑی میں ہی بیٹھا ہے۔"

"ماں جی، یہ سب تم واپس لے جاؤ۔ میں بھلا کیا کروں گا۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"نہیں صاحب، انہوں نے کہا تھا یہ میں آپ کو دے کر آؤں اور صاحب ــــــ"

زبیدہ کو اس پر رحم آرہا تھا۔ ہمدردی سے بولی: "اللہ کرے گا تو آپ کی کہیں اور بات ہو گی، آپ اسے چڑھایئے گا۔"

خالد پھیکی سی ہنسی ہنس دیا اور زبیدہ لوٹ گئی۔ تب وہ ٹوٹا ٹوٹا سا ایک کرسی پر گر گیا اور اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے ریسیور اٹھا لیا۔

"میں شہنا بول رہی ہوں۔" اُس نے بغیر کسی وضاحت کے کہا۔ تب ایک ہلکا سا سانس اُس کے لبوں سے آزاد ہو گیا۔ "مجھے افسوس ہے خالد صاحب" اس نے کہا۔

"کس بات کا افسوس؟" وہ ہلکے سے ہنسا۔

"آپ کے سامان کی نیلامی کا۔"

"بس۔"

"جی۔" اس کی آواز لرز گئی۔

"اور کسی بات کا نہیں ——؟"

تب وہ کچھ نہیں بولی خاموش رہی۔

"اچھا خدا حافظ۔" اس نے کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

شہنا ہاتھ میں ریسیور تھامے ساکت سی بیٹھی رہ گئی۔ وہ تو اس سے بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر وہ —— اور تب اس نے سلسلہ ڈسکنکٹ کر کے دوبارہ اس کے نمبر ملائے۔

"کون؟" اس کا لہجہ جیسے کراہ رہا ہو۔

"میں —— شہنا ——" وہ چپ رہا۔ "خالد ——" وہ آہستہ سے بولی —— "آپ —— آپ خود سوچیے نا۔ قصور میرا تو نہیں، آپ مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟"

"میں کسی سے ناراض نہیں ہوں۔" وہ مدھم سی آواز میں ہنسا۔ "سوچتا ہوں،

وہ پاس تھا تو خدا بھی تھا مہربان کیا کیا
بچھڑ گیا تو ہوئی ہیں عداوتیں کیسی
ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ ہیں ہم
جو بجھ گئے تو ہوا سے شکائتیں کیسی"

"کچھ اور سنائیے" وہ جانے اپنے کس جذبے کی تسکین پا رہی تھی۔

تب اس نے ایک گہرا سانس بھر کے کہا:

"سارہ جی، اپنے دل کی کیا سنائیں کیا کسی کی ہم سُنیں
آج کا انسان ہے گونگا کہیں بہرا کہیں
اور ـــــ دل کی قیمت ایک جیسی تو نہیں ہے آج کل
یہ بھی جسموں کی طرح مہنگا کہیں سستا کہیں"

تب اس کے گلے میں کچھ اٹکنے لگا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ مگر الفاظ نے زبان کا ساتھ ہی نہ دیا۔

"ایک بات کہوں سارہ؟" وہ کہہ گیا۔

تب اس کے منہ سے بمشکل "ہوں" نکلا۔

"مجھے فون نہ کیا کرو" وہ آہستہ سے بولا۔ "یہ ظلم ہے"

"کیا آپ کو مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہیں" وہ جیسے اُس سے ٹوٹنا نہ چاہتی ہو۔ "میں آپ کا زندگی بھر تو ساتھ نہیں دے سکتی خالد، لیکن جب تک اس دنیا میں موجود ہوں آپ اپنا دکھ درد مجھ سے کہہ لیا کیجیے ـــــ"

اور جواب میں وہ ہنس پڑا، بولا:

قہقہے ہیں نا آہ و زاری ہے

کب سے ہم پہ جمود طاری ہے

ہو گئی طاقتِ فغاں رخصت

اب بھی ان کا عتاب جاری ہے

مجھے امید ہے سارہ کہ تم آئندہ فون کر کے مجھ پر مزید ظلم نہیں کرو گی"

وہ جانے کیوں، ان بچھڑے ہوئے لمحوں اُسے شہنا کہنا بھول گیا تھا۔ تب بہت سی سسکیوں کو دل میں دبائے ہوئے شہنا نے فون بند کر دیا ـــــــ

۱۹

آپ کے آنے سے پہلے یاد تھا سب کچھ مجھے
یاد سب کچھ آئے گا آپ کے جانے کے بعد

اُسی دن موسم خاصا خوشگوار تھا۔ باہر سے آنے والی خوش کن ہوا سے پردے لہراتے تو شہنا کا دل بھی ہلکورے لینے لگتا۔ اُسے معلوم تھا کہ اس تقریب میں وہ بھی ضرور آئے گا۔ وہ تھوڑی بہت بات چیت کے بعد تقریبات میں شامل ہونے کی قائل نہیں تھی لیکن دل نے مجبور کیا اس نے نزہت سے حامی بھر لی اور اس وقت وہ اُسی کے ساتھ وحید کے بھائی کی سالگرہ میں شامل ہونے کی تیاری کر رہی تھی۔ زرد میکسی جس پر چھوٹے چھوٹے نیلے رنگ کے پھول بھرے ہوئے تھے اور نیلے رنگ کا ہی رومال، جس میں اس کا صبیح چہرہ بہت معصوم اور جاذب نظر لگ رہا تھا۔ بالوں میں باندھ کے اس نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور جھک کر کیوٹیکس اٹھالی ــــ زرد رنگ کی نیل پالش ناخنوں پر لگاتے ہوئے وہ مدھم سروں میں گنگنا رہی تھی ــــ اور پھر ــــ یک لخت اس کا ہاتھ رُک گیا۔ لبوں سے مسکراہٹ جیسے کسی نے نوچ لی ہو۔ اس نے سوچا بھلا وہ اس قدر مسرور کیوں ہے؟ دل نے کہا۔ "کسی کی ملاقات کے تصور سے ــــ مگر کیوں؟" اس نے لب دبا کے آنکھیں بند کر لیں۔ یوں ایک بار ملنے سے وہ اس کا اپنا تو نہیں ہو جائے گا۔ اس نے پاگل دل کو تسلی دی اور سوچا ــــ آج کی تقریب میں وہ شرکت نہیں کرے گی ــــ تب اس لمحے نزہت چلی آئی۔

"اوہ تو تم تیار ہو، میں سوچ رہی تھی کہ مجھے انتظار کرنا پڑے گا۔" مگر پھر اس

کی حالت دیکھ کے چونک گئی۔ نیلے رومال کے ہالے میں اس کا چہرہ میکسی کا ہم رنگ ہو رہا تھا۔

"کیوں تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے پریشانی سے پوچھا۔

"نہیں" اس کے لبوں سے بمشکل آواز نکلی۔ "میں ___ میں نہیں جا سکوں گی نزہت"

"تم پگلی ہو" نزہت نے گھر کا۔ "یوں گھر میں بیٹھ کے طبیعت اور خراب ہو گی۔ یقین کرو پارٹی بہت اچھی رہے گی ___ میرے کزن شاہد موسیقی سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ انہیں کے ہم ذوق ان کے چند دوست بھی تقریب میں شامل ہوں گے بمع اپنے سازوسامان کے ___ اور وہ آپ کے فن کار خالد وصی بھی سنا ہے بہت اچھی آواز کے مالک ہیں" وہ مسکرائی تو شہنا چونک گئی۔ یہ لڑکی کچھ عرصہ پہلے ہی ان کے سامنے والے مکان میں آئی تھی اور اسے کسی بات کا علم نہ تھا اور شہنا بھی نہیں چاہتی تھی کہ اس کے دل کی حالت سے یوں لوگ واقف ہو جائیں۔ وہ تماشا نہیں بننا چاہتی تھی۔ شاید اسے وحید نے کچھ بتایا ہو، اس نے سوچا۔

"بھئی وہی تمہاری سہیلی کے بھائی ___ بھول بھی گئی" نزہت نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔ "چلو اُٹھو بھئی" اس نے بازو سے تھام کے اسے اُٹھانا چاہا تو وہ التجا سے بولی:

"پلیز نزہت، میرا بالکل جی نہیں چاہ رہا عجیب سی طبیعت ہو رہی ہے" وہ کھڑی تو ہو گئی مگر جانے کو تیار نہ تھی۔

"آنٹی دیکھیے!" نزہت اب اندر آتی ہوئی بیگم غوری سے مخاطب تھی "تیار ہونے

کے بعد پتا نہیں کیا ہو گیا اسے، اب کہتی ہے میں نہیں جاؤں گی"۔

انہوں نے ایک گہرا سانس چھوڑ کے بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی دلی کیفیت کو جانتی تھیں آہستہ سے بولیں۔

"بیٹیا جاؤ، دل بہل جائے گا۔ گھر میں بیٹھ کے اکیلے سوچو گی تو طبیعت خراب ہو گی، جاؤ۔"

اس نے عجیب شاکی سی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا اور نظر جھکا لی۔

"جاؤ بیٹیا چلی جاؤ۔" انہوں نے قریب آ کے اس کی پشت تھپتھپائی جیسے تسلی دے رہی ہوں ـــــ اور وہ آہستہ قدموں سے نزہت کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

"واپسی پر دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہوں آنٹی۔" نزہت نے کہا۔ "وہاں سے کوئی چھوڑ جائے گا۔"

"اچھا بیٹیا۔" بیگم غوری نے کہا اور وہ دونوں سلام کر کے کمرے سے باہر نکل آئیں۔

وحید کے گھر پہنچیں تو مہمان خاصے پہنچ چکے تھے۔ اس کی نظروں نے بے تابی سے کسی کو تلاش کیا اور پھر وہ چند لوگوں میں کھڑا نظر آ گیا۔ سرمئی رنگ کے سوٹ میں وہ بہت اداس محسوس ہوتا تھا۔ اس لمحے جب شہنا اسے دیکھ رہی تھی اس کی نگاہ بھی اٹھ گئی اور پھر لمحے بھر کو اٹک کے رہ گئی۔ وہ نگاہ کو بھلی لگی تھی۔ شہنا کے دل میں کئی خوشگوار دھڑکنوں کا اضافہ ہوا مگر اگلے ہی لمحے خالد کی آنکھوں میں ابھر آنے والے کرب نے اسے غمزدہ کر دیا۔ وہ نزہت کے ساتھ سیدھی اس سمت بڑھ آئی جہاں وحید اس سے باتوں میں مصروف تھا۔ اس نے قریب پہنچ کے مدھم آواز

میں سلام کیا اور اسی لہجے میں جواب پایا۔

ریحانہ بھی انہیں دیکھ کے اس طرف آ گئی تھی۔ علیک سلیک کے بعد اس نے نزہت سے کہا۔

"آؤ کچھ ہاتھ تو بٹاؤ میرا ـــــ" اور نزہت مسکرا کے اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ تب وہ لوگ وہیں کرسیاں کھسکا کے بیٹھ گئے۔ چند لمحے خاموشی رہی، پھر وحید نے انہیں مخاطب کر کے کہا:

"بہتر ہے میں درمیان سے اٹھ جاؤں تاکہ آپ لوگ کچھ تو بات کر سکیں"

"اب کوئی بات نہیں رہی۔" خالد نے پھیکی سی ہنسی ہنس کے کہا۔

"آپ نے کچھ ریحانہ یا نزہت کو تو نہیں بتایا؟" شہنا وحید سے مخاطب تھی۔ اور آواز سے پریشانی مترشح تھی۔

"کس بات سے ڈرتی ہیں آپ؟" خالد کے لہجے میں ہلکی سی چبھن تھی۔

"جی؟" وہ کچھ گھبرا سی گئی پھر آہستہ سے بولی۔ "اب فائدہ بھی کیا ان باتوں سے۔"

"شہنا بہن ـــــ" وحید سنجیدگی سے بولا۔ "میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ خالد نے آپ کے حصول کے لیے کیا کچھ کیا، میں صرف اتنا کہوں گا کہ آپ نے اتنی اہم بات کو ایسا معمولی کیسے جان لیا؟"

"جی؟" وہ وحید کی طرف دیکھ کے رہ گئی۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ اپنی اپنے والدین سے صاف بات بھی تو کر سکتی تھیں؟"

"وحید بھائی" اس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ "بس یہی نہیں ہو سکتا"

"شہنا سچ کہتی ہے وحید، اب ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں" خالد نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں" وحید اُس لمحے بہت سنجیدہ تھا۔ "میں شہنا کو مجبور کروں گا کہ وہ اپنے والدین سے بات کرے۔ خود نہیں تو کسی سہیلی کے ذریعے ہی"

"میں تمہاری بات سے متفق نہیں ہوں وحید" خالد نے لب کاٹ کے کہا۔ "اس لیے بہتر ہے کہ میں اُٹھ جاؤں" اس نے کرسی چھوڑ دی۔

تب اس کے جانے کے بعد وحید نے شہنا سے کہا:

"شہنا بہن، خالد بہت جذباتی لڑکا ہے۔ آپ نے ایسے وقت اس کا ساتھ چھوڑا ہے۔ جب دُکھوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے"

"میں کچھ بھی نہیں کر سکتی وحید بھائی" اُس کی آواز بھرا گئی۔ "ہمارے معاشرے میں ایک مشرقی لڑکی کی کیا حیثیت ہے۔ یہ آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں"

"تعجب ہے آپ اس دور میں بھی خود کو مشرق کی مجبور بیٹی سمجھتی ہیں" وحید کو غصہ آ گیا۔ "آپ پڑھی لکھی لڑکی ہیں، پرانے زمانے کی بے زبان لڑکی نہیں ہیں۔ جسے ایک جانور کی طرح ایک کھونٹے سے دوسرے کھونٹے میں باندھ دیا جاتا تھا۔ آج آپ جو اپنے حق کے لیے آوازیں بلند کر رہی ہیں، جلسے کرتی ہیں، تقریریں کرتی ہیں، مضامین لکھتی ہیں وہاں آپ صرف اتنا نہیں کہہ سکتیں کہ آپ اپنی مرضی کے خلاف زندگی کا ساتھی نہیں بنائیں گی۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتیں کہ آپ اسی سے شادی کریں گی جسے خود آپ کے والدین نے آپ کی زندگی سے وابستہ کیا تھا۔ میں نزہت

سے کہوں گا کہ وہ آپکے والدین کو سمجھائے۔"

"وہ کبھی نہیں مانیں گے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ "اس سے پہلے بھی میری خالہ زاد بہن نے ابّی کو بہت سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اُس نے یہاں تک کہا تھا کہ شہنا اب کبھی شادی پر تیار نہ ہوگی۔ تب میرے ابّی کو غصّہ آ گیا تھا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ ہم جانتے بوجھتے اسے کنوئیں میں نہیں دھکیلیں گے۔ اگر شہنا ہماری مرضی کے خلاف ہے تو اسے کہہ دو، جائے اپنی مرضی سے شادی کر لے، اور وحید بھائی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "ابّی کے ان الفاظ نے مجھے اس قدر تکلیف پہنچائی کہ میں تڑپ کے رہ گئی۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے باپ کو مجھ سے یہی امید تھی۔ میں ممّی سے لپٹ کر دیوانہ وار رو پڑی۔ تب میرے ابّی خود بھی میرے ساتھ رو پڑے تھے اور آہستہ سے کہا تھا ــــ بیٹیا، ہمیں تم پر اعتماد تھا ــــ اور اب بھی ہے۔ غصے میں انسان بہت کچھ کہہ جاتا ہے ہمیں معاف کر دو ــــ اور میرے دل سے اُٹھتی ہوئی آگ مدھم پڑ گئی تھی ــــ" وحید خاموشی سے سُن رہا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر آہستہ سے بولا۔

"اس وقت جو حالت خالد کی ہے اُس سے میں ہی واقف ہوں وہ آپ کو کس قدر چاہتا ہے اس کا آپ کو شاید اندازہ نہیں۔ اچھی لڑکی اسے اب بھی مل سکتی ہے، لیکن وہ تنہا رہنا چاہتا ہے۔"

"میں ــــ میں کیا کروں وحید بھائی۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"خدا کے لیے کچھ غور کریں شہنا، وقت گزر جائے گا تو آپ بہت پچھتائیں گی، آپ کا محبوب مر جائے گا۔ آپ کی محبت مر جائے گی تو آپ کہیں بھی سکون نہ پا

سکیں گی۔"

"آپ ہی بتائیے میں کیا کروں؟" وہ بے بسی سے بولی۔

"آپ اپنا حق مانگیے نہیں، خود حاصل کریں۔ ایک انسان کی زندگی کے لیے —— میرا خیال ہے اگر آپ سول میرج بھی کر لیں تو گناہ نہیں —— والدین بعد میں خود ہی راضی ہو جاتے ہیں ——"

"وحید بھائی۔" شہنا تڑپ گئی۔ "آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے محبت عزت سے پیاری ہے۔"

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں شہنا۔ اس میں آپ کی بے عزتی نہیں ہے۔"

"ہاں۔" شہنا نے ایک گہرا سانس کھینچا۔ "خالد کے بجائے اگر میرا باپ مر گیا تو شاید آپ اسے میری عزت ہی سمجھیں گے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میرا باپ جس نے اپنی بیٹی پر اعتماد کیا ہے، یہ ٹھیس برداشت کر سکے گا۔ وہ زندہ رہے گا یہ چوٹ سہہ کر بھی —— نہیں وحید بھائی، میرا باپ بے عزتی کی زندگی سے بہتر موت کو پسند کرے گا وہ خود کو شوٹ کر لیں گے وحید بھائی —— مجھے معلوم ہے میں اپنے ابّی کو جانتی ہوں —— اور، اور یہ دو زندگیاں جو مجھے پیاری ہیں میں ان میں سے ہر حال میں اسے بچانے کی کوشش کروں گی جو میری عزت کو بھی بچا سکے —— اور آپ کہتے ہیں محبت مر جائے گی، تو وحید بھائی آپ نہیں سمجھتے، محبت کے جذبے کو کبھی موت نہیں مل سکتی وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے اس وقت تک جب تک دل زندہ رہتے ہیں۔ آپ خالد کو سمجھائیے، وہ زندگی جو خدا کا عطیہ ہے اُس سے کھیلنے کی کوشش نہ کرے۔ دنیا میں دلچسپی لے اور بہادروں کی طرح حالات کا مقابلہ کرے۔"

"آپ خود اس سے بات کریں" وحید نے ہلکا سا سانس بھر کے کہا۔

تب ہی معلوم ہوا کہ بچہ کیک کاٹنے کی رسم ادا کر رہا ہے۔ بیشتر مہمان اسٹیج کے گرد جمع ہو گئے تھے وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔ خاصی مشکل سے اُس کی نگاہوں نے اُسے تلاش کیا۔ وہ سب سے الگ تھلگ خاموشی سے اس ہنگامے کو دیکھ رہا تھا ـــــ اس کی انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا اور دھوئیں نے اُس کے چہرے کو اپنے ہالے میں لے رکھا تھا۔ وہ آہستہ قدموں سے اس کی جانب بڑھ آئی۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" قریب پہنچتے ہوئے مسکرا کے بولی۔

"جی" وہ چونک گیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "کچھ بھی نہیں"

"آپ بہت حساس ہیں خالد" اس نے گہرا سانس کھینچ کے کہا۔ "حالات کا جو تقاضا ہے آخر ہمیں ماننا ہی پڑے گا اُسے ـــ"

"میں پھر آپ کی بات دہراؤں گا" وہ ہلکے سے ہنسا۔ "کہ ایسی باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ـــ"

"آپ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے؟" اس کے لہجے میں دُکھ کی آمیزش تھی۔

تب خالد خود پہ قابو نہ رکھ سکا ایسی گہری اور جلتی ہوئی نظروں سے اس کے چہرے پر دیکھا کہ وہ نروس ہو گئی، نظر چرا کے بولی۔

"میں نے آپ کو فون کیا تھا آپ نے جب بھی بات نہ کی۔ اس دن یہاں ملے تب بھی آپ بغیر کوئی بات کیے چلے گئے اور آج بھی آپ چاہ رہے ہیں کہ میں چلی جاؤں" خالد اب بھی کچھ نہیں بولا، خاموشی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ تب ہی کھانے پینے کے دوران میں ہی موسیقی کا سلسلہ بھی چل نکلا۔ کسی نے قمر جلالوی کی مشہور غزل چھیڑ دی تھی:

ساتھ دینا ہے تو زندگی بھر کا دو
دو گھڑی کا سہارا سہارا نہیں

دونوں کی نظریں ملیں اور شہنا نے نظر جھکالی۔ وہ آہستہ سے بولا:

"آپ کو جواب مل گیا نا"

تب وہ چپ سادھ گئی۔ پھر ریحانہ اور نزہت اُن کی طرف آگئیں۔

"آیئے نا آپ لوگ بھی" ریحانہ نے کہا۔ تو وہ دونوں ان کے ساتھ ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔

اب وحید کا ایک کزن اپنی خوبصورت آواز میں نغمہ سرا تھا۔

ہم محبت کا بھرم کچھ اس قدر رکھتے رہے
آنکھ میں آنسو بھی آئے ہم مگر ہنستے رہے
وہ تخیّل کا تصوّر اور یادوں کے دیے
رات بھر جلتے رہے اور رات بھر بجھتے رہے
وہ کسی کی بے نیازی اور اپنا یہ جنوں
جو ہمیں بھولے انہی کو یاد ہم کرتے رہے
یہ ہمیں معلوم تھا وہ اب نہ گزریں گے کبھی
پھر نہ جانے کیا سمجھ کے راہ گزر تکتے رہے

شہنا نے خالد کی طرف دیکھا لیکن اب وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ بہت اداسی سے آہستہ آہستہ کوک پی رہا تھا ــــ موسیقی رُک گئی اور پھر کوئی نیا ساز شروع ہوا تھا ــــ اب ایک لڑکی جانے کس کے بدلنے کا شکوہ کر رہی تھی۔ شہنا کے دل میں کچھ

چبھنے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی :

مجھے معلوم ہے انجام محبت اے دوست
وقت کے ساتھ ہر اک چیز بدل جاتی ہے
جشن ہوتے نہیں ہر روز چھلکتے نہیں جام
پھول کھلتے نہیں امید کے گلشن میں مدام
ایک ہی وقت چمکتا ہے فقط ماہ تمام
جب تغیر سے عبارت ہے زمانے کا نظام
پھر مجھے تیرے بدلنے پہ تعجب کیوں ہے

"آپ بھی کچھ سنائیے۔" وحید کے ایک دوست نے خالد کو چونکایا ___ تو وہ آہستہ سے بولا :

"نہیں، ابھی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ___"

" ویسے ___" وحید نے اس کی جانب جھک کے کہا: "سنانے والے تمہارے ہی جذبات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔" اور ایک پھیکی سی مسکان اس کے لبوں پر اُبھر آئی۔

"بھئی یہ آج آپ لوگوں پر اداسیوں کا بھوت کیوں سوار ہے ؟" وحید کا ایک شوخ سا کزن بولا۔

"شاید یہاں کوئی درد میں مبتلا ہے ___" ایک لڑکی نے انکشاف کرنا چاہا۔

"چلو تم کوئی شوخ سا گیت سنا دو۔" وحید نے خالد کا ہاتھ دبا کے کہا۔

"اتنا حوصلہ نہیں۔" وہ مدھم سی ہنسی ہنسا۔ تب ہی وہ شوخ سا لڑکا اُٹھ گیا۔

؎ زندگی اک سفر ہے سہانا یہاں ___ کل کیا ہو کس نے جانا

اُس نے بڑا پیارا سا گیت گایا ـــــ لیکن شاید وہ شہنا نے نہیں سُنا وہ اپنے آپ میں گم تھی ۔ کیونکہ ریحانہ نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک گئی ۔

"آپ بھی کچھ سنائیں !" اور اُس کی آواز کئی لوگوں تک پہنچی تھی ۔ کیونکہ اس کے بعد ہر طرف سے مطالبہ ہونے لگا ـــــ تب شہنا نے خاموشی سے سر ہلا دیا ۔ جانے کیا بات تھی کہ اس لمحے طبیعت کی افسردگی نے اتنے لوگوں کی موجودگی کو بھی محسوس نہ کیا ۔ وحید تار کھینچتا ہوا مائیک اس تک لے آیا اور وہ مدھم آواز میں یوں گویا ہوئی :

ہم کشتیٔ حیات کو موجوں میں لے گئے
طوفاں ساحلوں کی طرف بھاگتے رہے
ٹھوکر لگی تو اور بھی کچھ تیز ہو گئے
گر گر کے حادثوں کی طرف بھاگتے رہے
زخموں کے اندمال کی حسرت لیے ہوئے
شیشے کے پتھروں کی طرف بھاگتے رہے
پھر بھی نہ قربِ دوست میسّر ہوا ہمیں
اک عمر فاصلوں کی طرف بھاگتے رہے

شہنا کی آواز بہت پیاری تھی یا پھر اس کی پیاری سی شخصیت کا اثر تھا ۔ لوگوں نے بہت سراہا ۔

"اب تم بھی اُٹھ جاؤ ۔" وحید نے خالد سے کہا ـــــ اور جانے کیا سوچ کے وہ بھی اٹھ گیا ۔

ندیم کی غزل تھی ـــــ جو موسیقی کے ساتھ بہت خوبصورت محسوس ہوئی :

ہر لمحہ اگر گریز پا ہے!
تو کیوں میرے دل میں بس گیا ہے
چلمن میں گلاب کھل رہا ہے
یہ تو ہے کہ شوخیٔ صبا ہے
جھکی نظریں بتا رہی ہیں
میرے لیے تو بھی سوچتا ہے
میں تیرے کہے سے چپ ہوں لیکن
چپ بھی تو بیانِ مدعا ہے
ہر دیس کی اپنی اپنی بولی
صحرا کا سکوت بھی صدا ہے
اور اس وقت کا حساب کیا دوں
جو تیرے بغیر کٹ گیا ہے
رونے کو اب اشک بھی نہیں ہیں
یا عشق کو صبر آ گیا ہے
اب کس کی تلاش میں ہیں جھونکے
میں نے تو دیا بجھا دیا ہے

خالد کی آواز کو بھی بہت سراہا گیا۔ اس کے بعد لوگوں کی فرمائش پر المیہ شاعری سے ہٹ کے کچھ طربیہ غزلیں پیش کی گئیں اور شام ڈوب جانے پر مہمان رفتہ رفتہ رخصت ہونے لگے۔ وحید کے ایک دوست نے گاڑی میں شہنا اور نزہت کو ڈراپ کر دیا تھا۔

وہ بھاری بھاری سا دل لیے گھر لوٹ آئی۔

تنہائی اور سوچیں گھیر گھیر کے اُسے ماضی کی طرف لے جاتی تھیں ___ بات طے ہو جانے سے پہلے وہ خالد کے خیال سے کیسا خوف کھاتی تھی۔ تنہائیوں میں اُس کی یادوں کے اُبھر آنے سے، خود کو مجرم سا محسوس کرنے لگتی تھی۔ وہ اس کے دل کی کیفیت سے ناواقف بھی تھی ___ پھر علم بھی ہوا تو ڈرتی تھی کہ کہیں جسے فرشتہ سمجھتی ہے وہ بھی عام سا انسان نہ نکلے ___ یوں اُس نے کبھی خالد کی حوصلہ افزائی نہ کی تھی۔ اُس کی بولتی ہوئی نگاہوں سے ہمیشہ انجان بننے کی کوشش کی تھی۔ اُسے معلوم تھا کسی اجنبی کی محبت دل میں بسا لینے کا انجام کیا ہوتا ہے ___ مشرق کی بیٹی کو بہر حال کسی کی بیوی بننا ہوتا ہے اور دل کی محبت کا مالک ___ اگر یہ رتبہ حاصل نہ کر سکے تو زندگی کیسی عذاب بن جاتی ہے۔ اس امر سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ یہی وجہ تھی کہ خالد کے خیالوں میں چاروں طرف سے گھر جانے کے باوجود، شہنا کے ذہن میں مجازی خدا کا ایک احترام تھا مگر جب اس کے اپنے والدین نے بڑی دھوم دھام سے خالد کو اس رُتبے کا احترام بخشا تو وہ دل و جان سے خالد کی ہو گئی۔ اب بلا خوف وہ خالد کو اپنے خیالوں میں لے آتی تھی، اس سے باتیں کرتی تھی۔ اس کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی۔ اس کی خدمت کرتی تھی اور کسی بھی خوف کے بغیر اس سے پیار کرتی تھی ___ وہ اکثر فون پر اس سے باتیں کیا کرتا تھا۔ اُن دنوں اس کی طبیعت کی ساری شوخی ابھر آئی تھی ___ وہ جانے کہاں کہاں کی، کس قدر آگے کی باتیں کیا کرتا تھا۔ تب ایک انجانے سے خوف کے تحت وہ اسے مستقبل سے واپس لے آتی۔ وہ مُسکرا کے

کہتا:

"پگلی، اب بھلا دن کتنے رہ گئے ہیں، ہمارے خوابوں کو حقیقت بن جانے ہیں۔۔۔ بس زیب کی شادی ہو جائے۔۔۔ پھر۔۔۔"

"پلیز خالد" اس کی آواز کانپ جاتی۔ "ایسی باتیں نہ کریں"

"ہاں واقعی" وہ شرارت سے بولتا۔ "اب ٹیلی فون پر باتیں کرنے کو جی بھی نہیں چاہتا۔۔۔ دل کہتا ہے، تم سامنے موجود رہو اور۔۔۔"

"خالد" وہ اسے پھر تنبیہ کرتی۔

"تم نے اب گھر آنا بالکل چھوڑ ہی دیا" وہ بولا تو وہ خاموش رہی۔۔۔ "جس روز تم آخری بار آئی تھیں، بس وہی لمحے میری آنکھوں میں موجود ہیں" وہ بوجھل آواز میں بولا:

"میں نے ہر بار تجھ سے ملتے وقت
تجھ سے ملنے کی آرزو کی ہے
تیرے جانے کے بعد بھی میں نے
تیری خوشبو سے گفتگو کی ہے"

"کچھ اور۔۔۔" وہ ہنسی۔

"لیکن اب تو۔۔۔" اس کی آواز مسکرائی۔ "یہی کہوں گا کہ۔۔۔

اعتبارِ نمود منزل سے
جادہ پیمائیاں ملیں مجھ کو
جب بھی پھیلی ترے خیال کی دھول

صرف پرچھائیاں ملیں مجھ کو"

"اور جانے کب یہ پرچھائیاں حقیقت کا رُوپ دھاریں گی "۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔ "زیب کہاں ہے؟" وہ بات بدلنے کو بولی۔

"کہیں گئی ہے اپنی کسی سہیلی کے ساتھ "۔ اس نے بتایا۔ پھر پوچھا۔ "آپ نہیں جاتیں کسی سہیلی کے گھر؟"

"کیوں؟" وہ ہنسی۔

"ملنے کو دل چاہتا ہے "۔

"آجایئے کبھی گھر"۔

"آتا ہوں تو تم نظر کب آتی ہو"۔ وہ بولا۔

"اچھا اب آپ آئیں گے تو ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے جھانک لوں گی"۔ وہ شرارتاً ہنسی۔

"پھر میں وہ گیت گانے لگوں گا:

وہ جھروکے سے جھانکیں کوئی اُن سے کہہ دے

میں رُکوں یا چلا جاؤں ــــــــــ"

وہ ہنس پڑی ــــ اور یوں ہی ہنستے مسکراتے وہ دن گزر رہے تھے ــــ لیکن اب آنسوؤں کے دوران میں وہ سوچ رہی تھی ــــ کاش کہ والدین کے بات طے کرنے کے بعد بھی اس نے دل کے دروازے بند رکھے ہوتے، وہ دل میں آ کے یوں رگ رگ میں تو نہ اتر جاتا کہ اس کی جدائی اسے دیوانہ بنا دیتی ــــ اور پھر جب کسی کی ہو جانے کے بعد بھی اس نے اپنے تمام جذبات اور احساسات پر سہاگ کا رنگ پھیر

لیا تھا۔ قدرت نے کیسی ستم ظریفی کی۔ اُس کے مجازی خدا کو اس کے رُوپ میں بھیج دیا۔
تب اُس کا نازک دل بھلا کیسے یہ ستم سہتا ــــــ دل کے تمام احساسات و جذبات ــــــ
اس رنگ سے اُبھر کے باہر آ گئے ــــــ اور اس کا سہاگ رُوٹھ گیا ــــــ اُس نے
دوپٹے کے آنچل سے آنکھوں کے گوشے صاف کیے اور بستر سے نیچے اتر آئی۔ شام
کی چائے کا وقت ہو چکا تھا ــــــ اس نے سوچا، ساس کی خیریت معلوم کر لے ــــــ
اور دروازے سے نکل کے بیگم ملک کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

مل کے بچھڑ گیا تھا کوئی جس مقام پر
اب تک اسی مقام پر ہوں چپ کھڑا ہوا

حلیمہ بائی اس کا برابر خیال رکھ رہی تھی۔ اس کے کمرے کو گرم رکھتی ـــ دودھ اور سوپ گرم کر کے پلاتی ـــ باقاعدگی سے پھل کاٹ کے کھلاتی ـــ دوا کا خیال رکھتی ـــ خالد احسان مند تھا۔

اُس شام بھی حلیمہ بائی نے اس کے کمرے کو صاف کیا تھا ـــ اس کے پلنگ اور کرسیوں کے غلاف بدلے تھے اور اب اس کیلیے سوپ تیار کرنے گئی تھی ـــ اس وقت خالد کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔ سوپ پلا کے حلیمہ بائی نے اُسے بستر پر لٹا دیا۔

"آج تو میں ٹھیک ہوں اماں" اس نے مسکرا کے کہا۔ "بیٹھا رہنے دیں"

"نہیں بٹیا ـــ ابھی آرام کر ـــ پھر تو تجھے بیٹھنا ہی ہے ـــ تصویریں بناتے وقت تو کب پروا کرتا ہے ادھر ادھر کی ـــ کل بیٹھنے لگے گا تو پھر کھڑا ہو جائے گا تصویریں بنانے کو" حلیمہ بائی نے شفقت سے کہا اور وہ ہنس پڑا۔

"ہاں اماں، تم ٹھیک کہتی ہو۔ ابھی تو مجھے اپنے شاہکار کو دوبارہ جنم دینا ہے جس کے لیے واقعی مجھے نئی قوت چاہیے۔ میں آپ کا کہنا

مانوں گا اماں۔" حلیمہ بائی مسکرانے لگی۔

"تو رہنے والا کہاں کا ہے بٹیا۔" نہ جانے کیا سوچ کے انہوں نے سوال کیا تھا۔

"میں کراچی کا رہنے والا ہوں اماں۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"بٹیا۔" حلیمہ بائی نے ایک گہرا سانس بھر کے کہا۔" تو وہاں اپنی ماں کو تو نہیں چھوڑ آیا؟"

"نہیں اماں۔" وہ دُکھ سے بولا۔" وہاں تو میرا کوئی بھی نہیں—— میری ماں تو مدت ہوئی میرا ساتھ چھوڑ گئی تھیں—— مگر اماں تم نے یہ سوال کیوں کیا——" وہ کچھ سوچ کے بولا—— "اور تم بھی تو یہاں تنہا رہتی ہو—— کیوں اماں، کیا تمہارا بھی کوئی نہیں؟"

"نہیں بٹیا، میں بھی کسی کی ماں ہوں۔" وہ ایک سرد آہ بھر کے بولی۔" میرا بھی ایک بٹیا ہے جسے میں نے کبھی کسی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا—— اپنا پیٹ کاٹ کے اُسے پڑھایا لکھایا۔"

"وہ اب کہاں ہے اماں؟" خالد پوچھ بیٹھا۔

"وہ آج لندن میں ہے بٹیا—— بس ایک بار اپنے باپ کے مرنے پر آیا تھا اور پھر چلا گیا—— کتنے ہی خط لکھ کے اُسے بُلا چکی ہوں مگر وہ ایک بار بھی نہیں آیا—— بٹیا" اس نے سرگوشی کی: "جب میں مرنے لگوں تو اسے میری موت کی اطلاع دے دینا، وہ آ جائے گا—— اور میں آخری بار اسے دیکھ لوں گی۔"

خالد ماما کا یہ رُخ دیکھ کے کانپ گیا ـــــ وہ ہمدردی سے اُس جنّت کی جانب دیکھتا رہ گیا جس سے کسی بدنصیب نے منہ پھیر لیا تھا۔ اور پھر یہ حلیمہ بائی کی تیمار داری کا ہی اثر تھا کہ اُس کی حالت بگڑتے بگڑتے سنبھل گئی ـــــ اور چند دن بعد ہی وہ ایک بار پھر نئے سرے سے اپنے شاہکار کی تکمیل میں منہمک ہو گیا۔

شاہکار مکمّل ہوا، نمائش میں پیش ہوا اور اس تصویر نے آرٹ کی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا ـــــ خالد نے اپنا خونِ جگر دے کے اس تصویر کو رنگ بخشا تھا ـــــ اور اس قدر صحیح عکاسی کی تھی کہ حساس دل رنگوں سے چھلکتے ہوئے درد کے احساس سے بھر آئے تھے اور خالد وصی کی یہ تصویر جس کا عنوان "نقشِ پا" تھا، عالمی مقابلے میں پہلا انعام لے گئی۔ گولڈ میڈل کے ساتھ صدر کی جانب سے پانچ ہزار روپے کا نذرانہ پیش کیا گیا ـــــ اپنی اس کامیابی سے خالد بہت مسرور تھا۔ اس نے حلیمہ بائی کے لیے بہت سے کپڑے خریدے اور سونے کے ٹاپس جنہیں اپنے ہاتھ سے بیٹا بن کے وہ ماں کے کانوں میں پہنانا چاہتا تھا ـــــ

لیکن اُس دن اُسے احساس ہوا کہ اس کی ہر خوشی کسی بڑے غم کا پیش خیمہ ہوتی رہی ہے۔ وہ گھر پہنچا تو حلیمہ بائی کے پلنگ کے گرد بہت سی عورتیں جمع تھیں ـــــ اس کی زبان بند تھی اور آنکھیں بیٹے کی دید کی متلاشی ـــــ بیمار تو وہ کئی دنوں سے تھی مگر یوں موت

کے کنارے پہنچ جانے کی خالد کو امید نہ تھی ــــ اُس نے بلا کسی تاخیر اس کے بیٹے کو ٹیلی گرام دے دیا ــــ لیکن وہ آخر وقت تک نہیں پہنچا۔ اور حلیمہ بائی چل بسی ــــ

خالد کے دل کو گہرا صدمہ پہنچا تھا ــــ ایک بار پھر وہ تنہائیوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا ــــ بوڑھی عورت نے اس کی زندگی کو جو سہارا دیا تھا۔ اُسے فراموش نہیں کر پا رہا تھا ــــ وہ آخری وقت تک بیٹے کی دید کو ترستی رہی ــــ مگر وہ بے حس شخص نہیں پہنچا ــــ خالد بہت غمزدہ تھا ــــ یہ خیال اسے رہ رہ کے تڑپاتا تھا کہ ایک مامتا محروم چلی گئی اور وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔

محروم مامتا یہاں بھی تڑپ رہی تھی ــــ بیٹے کی دید کی پیاسی تھی۔ ڈاکٹر متفقہ فیصلہ دے چکے تھے کہ آئندہ پڑنے والا دورہ مسز ملک کی جان بھی لے سکتا ہے اور اُن کا رات دن اسلم کو پکارنا اس بات کی قطعی دلیل تھا کہ دورہ کسی بھی وقت پڑ سکتا ہے۔ واجد خورشید نے اسلم کی تلاش میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔ جہاں جہاں اس کے ملنے کا امکان تھا گاڑی لے کے دوڑ پڑا ــــ لیکن ہر بار مایوسی سے واپس لوٹنا پڑا۔ سارہ پریشان تھی۔ جس طرح محرومی کے دنوں میں مسز ملک نے اپنی پُر شفقت گود میں اسے پناہ دی تھی۔ اب وہ اس دنیا میں کہاں پا سکتی تھی ــــ چند دن پہلے اُس کے والدین بھی بیٹی کے فرض سے سبکدوش

ہو کے دیارِ حبیب کو جا چکے تھے۔ اُسے وہ دن یاد آنے لگا جب وہ مسز ملک کے ساتھ اپنے والدین سے ملنے کراچی پہنچی تھی — قیمتی لباس اور بھاری زیورات میں لدی ہوئی بیٹی کی اُجڑی ہوئی صورت ماں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

"اسلم میاں کیوں نہیں آئے؟" انہوں نے بے قراری سے پوچھا اور مسز ملک نے کہا تھا۔

"اُسے مریضوں سے فرصت کہاں بیگم غوری — اور آج کل تو وہاں وبائی امراض کا زور ہے"۔

تب بیگم غوری نے ٹھنڈا سانس بھر کے سوچا تھا — ڈاکٹر اکثر ایک فرض میں منہمک ہو کے دوسرے فرض سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ کاش کہ انہوں نے پہلے سوچا ہوتا۔

"مگر مسز ملک"۔ وہ آہستہ سے بولیں۔ "اسلم میاں نے یہ پیشہ شوقیہ اپنایا تھا۔ ماشاء اللہ انہیں ضرورت بھی کیا ہے ڈاکٹری کی — چھوڑ کیوں نہیں دیتے اس سلسلے کو"۔

"بس کیا بتاؤں آپ کو —" مسز ملک نے ایک گہرا سانس بھر کے کہا۔ "یہی تو لگن ہے اس کی — جس سے غافل ہونا اس کے لیے ناممکن ہے —" اور اس کے ماں باپ بیٹی کا غم لے کے رخصت ہو گئے۔ لیکن مسز ملک بیٹے کا غم نہیں سہار سکی تھیں — بستر سے آ لگیں۔ رات دن اسلم کو پکارا کرتی تھیں — سارہ کی صورت دیکھ کے روتی تھیں۔

آخر ڈاکٹروں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے ڈاکٹر اسلم کو متوجہ کیا جائے ___ اسی شام اخبار میں اعلان دے دیا گیا۔ ریڈیو سے بھی اعلان کیا گیا اور ٹی وی پر بھی خود سارہ نے اُسے واپس لوٹنے کی درخواست کی ۔ ریڈیو اور ٹی ۔ وی سے دن میں کئی کئی بار اعلان ہوتا رہا ۔

" ڈاکٹر اسلم حمید آپ کی ماں کی حالت بہت نازک ہے آپ کا نام لے کے بار بار پکارتی ہیں ۔ کسی وقت بھی دل کا دورہ پڑنے کا خطرہ ہے اور ڈاکٹروں کی رائے میں آئندہ پڑنے والا دورہ ان کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے ۔ خدارا واپس لوٹ آیئے ___ اپنی ماں کی زندگی بچا لیجیے ___ وہ آپ کو پکار رہی ہیں ___ "

۲۱

اپنے دل کی کیا سنائیں کیا کسی کی ہم سُنیں
آج کا انسان ہے بہرا کہیں گونگا کہیں

اِس پکار سے بے خبر ڈاکٹر اسلم کا ذہن و دل شیشے میں ڈوبا رہا ــــ وہ نشے میں مدہوش اس وقت بھی شہر کے ایک گمنام سے ہوٹل کے بار میں موجود تھا ــــ بصارت و سماعت پر نشہ چھایا ہوا تھا، تو نہ کسی کی دُکھی پُکار سُن سکا ــــ اور نہ وہ افسردہ چہرہ دیکھ سکا جو اس لمحے بھی بڑے درد سے کہہ رہا تھا:

"اپنی ماں کی زندگی بچا لیجیے ــــ وہ آپ کو پکار رہی ہیں"۔

ڈاکٹر اسلم ایبٹ آباد میں رُکا نہیں تھا ــــ کسی دوست یا کسی جاننے والے کو اطلاع دیے بغیر پنڈی چلا آیا تھا ــــ اور یہاں ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔

ہال میں ٹیلی ویژن آن تھا لیکن لوگ اُس جانب زیادہ توجہ نہیں دے رہے تھے اور اپنے اپنے مشاغل میں مگن تھے ــــ مگر بار کے کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا نوجوان اتفاق سے ٹی وی کی طرف متوجہ تھا، جہاں سارہ اپنے چہرے پر افسردگی سمیٹے ہوئے دھیمے لہجے میں بول رہی تھی:

"ڈاکٹر اسلم حمید، آپ کی ماں کی حالت بہت نازک ہے۔ آپ کا نام لے کے بار بار پکارتی ہیں۔ کسی وقت بھی دل کا دورہ پڑنے کا خطرہ ہے

اور ڈاکٹروں کی رائے ہیں آئندہ پڑنے والا دورہ ان کے لیے جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے ___ خدارا واپس لوٹ آئیے ___ اپنی ماں کی زندگی بچا لیجیے وہ آپ کو پکار رہی ہیں ___"

اس کے فوراً بعد ہی سکرین پر ڈاکٹر اسلم کی تصویر لرزنے لگی. نوجوان کی نگاہ سکرین سے ہٹ کے اب ہال کا سرسری جائزہ لے رہی تھی مگر اسلم پر نگاہ پڑتے ہی ٹھٹک گئی ___ اور کاؤنٹر چھوڑ کے وہ تیزی سے اس کی میز کی طرف بڑھ آیا ___ ڈاکٹر کی میز سے دو میزیں چھوڑ کے ایک ادھیڑ عمر شخص اخبار پڑھنے میں منہمک تھا - اس کے قریب دوسری کرسی پر ایک نوجوان لڑکی تھی جو خاموشی سے ادھر ادھر نظریں دوڑا رہی تھی ___ شاید انہوں نے بیرے کو کوئی آرڈر دیا تھا ___ اور اب اس کے منتظر تھے ___ اچانک اخبار پڑھتے ہوئے شخص نے لڑکی کی توجہ ایک خبر کی جانب مبذول کروائی - لڑکی نے کچھ دیر سطور پر نگاہ دوڑائی ___ اور پھر بے اختیار ڈاکٹر اسلم کی طرف دیکھا .

"کیا وہی ڈاکٹر اسلم نہیں " اس نے اشارہ کیا .

معمر شخص نے پلٹ کے دیکھا پھر وہ جلدی سے اٹھ گیا ___ " ہاں بلاشبہ وہی ہے "

لڑکی نے اخبار اٹھا لیا تھا اور دونوں اس کی میز کی جانب بڑھنے لگے ، جہاں کاؤنٹر مین اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا ___ وہ دونوں میز کے قریب پہنچ گئے .

"جناب، یہ آپ کے نام پیغام ہے" لڑکی نے جھک کے اخبار اس کے سامنے پھیلایا۔

اسلم نے آنکھوں کے گوشے سیکٹر کے تینوں کو باری باری دیکھا —— پھر خاموشی سے بوتل اٹھا کے سرخ رنگ کی شراب شیشے کے گلاس میں اُنڈیلنے لگا —— لڑکی اخبار اس کے سامنے کرتے ہوئے بولی:

"ہوش میں آیئے ڈاکٹر —— یہ آپ کی بیوی شہنا ساحرہ کی جانب سے آپ کو پیغام ہے"

اسلم نے چونک کے لڑکی کو دیکھا، پھر ایک جھٹکے سے اخبار اس کے ہاتھ سے لے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

"یہ آپ نے کیا کیا؟" معمر شخص نے لب بھینچ کے کہا۔ "کیا آپ اپنی ماں کو موت کے منہ سے نکالنا پسند نہیں کرتے؟"

"کس کی ماں؟" اُس نے لڑکھڑاتے لہجے میں پوچھا۔

"آپ کی ماں ڈاکٹر ——" نوجوان جو اُن دونوں کے آنے پر خاموش ہو گیا تھا پھر بولا:

"اُن کی جان خطرے میں ہے —— اور وہ آپ سے ملنے کی خواہشمند ہیں، شاید آپ انہیں بچا لیں"

"میری امّی" وہ بڑبڑایا۔

اسی لمحے سارہ سکرین پر نمودار ہوئی، اعلان ایک بار پھر دُہرایا جا رہا تھا۔

"وہ دیکھیے۔" نوجوان نے کہا۔

اسلم نے اپنی خمار آلود آنکھوں کو ٹی۔وی کی طرف گھمایا ــــ ادھر معمّر شخص اور نوجوان لڑکی بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ کہہ رہی تھی:

"ڈاکٹر اسلم حمید، آپ کی ماں کی حالت بہت نازک ہے۔"

"امّی۔امّی۔" وہ چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کے بچّوں کی طرح رونے لگا۔

شہنا کی آواز اب بھی برابر آ رہی تھی:

"کسی وقت بھی دل کا دورہ پڑنے کا خطرہ ہے ــــ اور آئندہ پڑنے والا دورہ اُن کے لیے جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے ــــ خدارا واپس لوٹ آئیے ــــ"

شہنا التجا کر رہی تھی اور اس التجا پر اسلم کے حواس چوکنّا ہو گئے ــــ اس نے آنکھیں پوری کھول کے سکرین پر دیکھنے کی کوشش کی ــــ وہاں شہنا کا چہرہ تھا سوگوار اور پریشان حال ــــ

تب ڈاکٹر اسلم کی نگاہوں کی سُرخی بڑھ گئی، ہونٹ بھنچ گئے اور مُٹھیاں کَستا ہوا پاگلوں کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا:

"مَیں اس کی صورت سے نفرت کرتا ہوں ــــ دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔"

اُس نے غصّے سے اپنے اطراف کھڑے ہوئے لوگوں پر نظر ڈالی اور کرُسی کو ٹھوکر مارتا ہوا اوپر کی سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔

"شاید وہ اپنے کمرے میں جا رہا ہے۔" کسی عورت نے کہا۔

"کیا یہ الفاظ وہ اپنی ماں کے لیے کہہ رہا تھا؟" نوجوان لڑکی معمّر شخص سے پوچھ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے مزید پھیل گئی تھیں۔

"نہیں ——" مرد نے غور سے اُس کے چہرے پر دیکھا۔ "یقیناً وہ اپنی بیوی سے بدگمان تھا۔"

لڑکی نے چند لمحے اپنی سیاہ پلکیں جھپکیں پھر نظر جھکا لی۔

ہوٹل کا مینجر بھی اپنے کمرے سے نکل آیا تھا —— کاونٹر مین نے اسے حالات سے آگاہ کیا اور پھر وہ لوگ ایک دوسرے اخبار سے اعلان تلاش کر کے ایبٹ آباد ہسپتال فون کرنے لگے۔

کال واجد خورشید نے ہی رسیو کی تھی۔ پھر بہت جلد وہ ہوٹل پہنچ گیا۔ لیکن یہاں آ کے معلوم ہوا، ڈاکٹر اسلم حمید یہ جگہ چھوڑ کے جا چکا تھا۔ واجد پورا دن اس کا منتظر رہا اور رات گئے آخر اُسے مایوس واپس لوٹنا پڑا۔ ہوٹل کے مینجر کو وہ یہ ہدایت کر آیا تھا کہ جیسے ہی اسلم وہاں آئے وہ فوراً اسے اطلاع دے دے —— اور خاص طور سے اس کی نگرانی کرے —— لیکن وہ حیران ضرور تھا کہ آخر ماں کی حالت جان کے بھی اُسے ہوش کیوں نہیں آیا۔

۲۲

اندھیری رات ہے کھولو کواڑ آنے دو
تمہارے شہر کی گلیوں میں پھر رہا ہے کوئی

خالد تھکے تھکے قدم اٹھاتا ہوا ریسٹورنٹ میں داخل ہوگیا۔ کئی میزیں خالی تھیں۔ اس نے نسبتاً کونے کی میز منتخب کی اور آگے بڑھ کے خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا

"کیا چاہیے صاحب؟" بیرے نے قریب پہنچ کے کہا۔

"چائے اور سینڈوچز ——" وہ ہولے سے بولا۔

چند لمحے خاموش بیٹھا خلا میں گھورتا رہا —— پھر میز پر پڑا ہوا اخبار کھول کے پڑھنے لگا —— اور یک لخت اس کی پلکیں ساکت رہ گئیں —— وہ تصویر اسی کی تھی —— "لیکن نہیں ——" وہ غور سے تصویر کے ساتھ دیے گئے اعلان کی عبارت پڑھنے لگا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل سے درد کی ایک ٹیس اٹھ کے تمام جسم میں دوڑ گئی ہو —— ایک ماں پھر تڑپ رہی تھی اور بے درد اولاد اس تڑپتی ہوئی ممتا سے بے نیاز تھی —— وہ کیسا مسیحا تھا —— خالد نے دکھ سے سوچا —— "دوسروں کو زندگی دینے والا مسیحا، اپنی ہی ماں کے لیے موت کا سامان کر رہا تھا۔ حلیمہ بائی کا خیال آتے ہی اُس کی آنکھیں بھر آئیں —— ہتھیلیوں سے اُس نے اپنی آنکھوں کو بھینچا، شاید نمی جذب کی تھی —— پھر وہ کرسی دھکیل

کے اُٹھ گیا۔

اُس کا رُخ فون باتھ کی جانب تھا۔ وہاں پہنچ کے اس نے نمبر ڈائیل کیے ___ وہ ڈاکٹر واجد خورشید کے تھے اور یہ اعلان اس کی طرف سے شائع کیا گیا تھا ___ انہوں نے ڈاکٹر اسلم سے درخواست کی تھی کہ وہ محض چند لمحوں کے لیے اپنی ماں کو صورت دکھا جائے ___ خواہ پھر واپس لوٹ جائے ___ کیونکہ اس کی ماں کا آخری وقت قریب آپہنچا ہے۔

فون ریسیو کرنے والا واجد خورشید ہی تھا۔

"میں بیگم اکرم کے متعلق معلومات چاہتا ہوں وہ آج کل اسی ہسپتال میں ہیں؟" خالد نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"انہیں گھر لے جایا جا چکا ہے۔" واجد کی آواز سے حیرت جھلک رہی تھی۔ "لیکن آپ کون صاحب بات کر رہے ہیں؟"

خالد چند لمحے سوچتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

"ڈاکٹر، آپ مجھے بیگم ملک کا ہمدرد سمجھ لیں ___ بس اس کے علاوہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اُس نے رُک کے کہا۔ "میں بیگم ملک کا ایڈریس چاہتا ہوں۔"

"لیکن آپ کس سلسلے میں اُن سے ملنا چاہتے ہیں؟" واجد نے پوچھا۔

"ڈاکٹر۔" خالد نے خشک لہجے میں کہا۔ "آپ بلا کسی تاخیر مجھے ایڈریس بتا دیں۔ اگر آپ ایک ضعیف عورت کی جان بچانا چاہتے ہیں۔"

"کیا آپ ڈاکٹر اسلم حمید کے بارے میں کوئی اطلاع دینا چاہتے ہیں؟"

"یہی سمجھ لیں۔" خالد کا لہجہ اس بار بھی خشک تھا۔

تب ڈاکٹر واجد نے زیادہ استفسار مناسب نہ سمجھا ـــــ اور بیگم ملک کا ایڈریس اسے تفصیل سے نوٹ کروا دیا۔

خالد بوتھ سے ہٹا اور تیز تیز قدم اٹھاتا اپنی میز پر آگیا ـــــ بیرا اس کے آرڈر کی تعمیل کر چکا تھا ـــــ چائے اور سینڈوچز میز پر موجود تھے۔ مگر چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ خالد نے بیرے کو اشارے سے بل لانے کے لیے کہا ـــــ اور ٹھنڈی ہی چائے حلق سے انڈیل لی۔

بیرے نے بل لانے میں تاخیر نہیں کی ـــــ اس نے پانچ کا نوٹ ٹرے میں رکھا اور تیز قدموں کے ساتھ ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

بیگم ملک کو ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا ـــــ لیکن شہنا کو بڑی احتیاط کے لیے کہا تھا ـــــ ہسپتال سے آنے کے بعد بیگم ملک کی صحت بہت گر گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے تمام خون نچوڑ لیا گیا ہو ـــــ چہرے کی رنگت ہلدی کی طرح زرد تھی مگر پھر بھی مدھم آنکھوں میں امید کی روشنی تھی ـــــ ہر چند کہ ڈاکٹروں نے قطعی جواب دے دیا تھا۔ مگر مامتا کے زور سے سانس اٹکی ہوئی تھی ـــــ انہیں اسلم کے آنے کی اُمید تھی ـــــ وہ کہتی تھیں، اسلم ان سے دودھ بخشوانے ضرور آئے گا ـــــ یوں تو وہ روز ہی سارہ سے اسلم کا تذکرہ کرتی تھیں لیکن اُس

دل نہ جانے کیوں اُن کی مامتا بڑی بے چین تھی۔

"مجھے لگتا ہے سارو، وہ لوٹ آیا ہے۔" لیٹے لیٹے یک لخت انہوں نے کہا۔

اور سارہ اُن کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"تم اس کے جاننے والوں میں فون کرو ____ سب جگہ کرو۔" وہ بولیں۔

اور سارہ کے لبوں پر دھیمی سی مُسکان آ گئی ____ ایسا کئی بار ہو چکا تھا ____ اور سوائے مایوسی کے انہیں کچھ حاصل نہ ہوا تھا ____ مگر ماں کی تسلی کے لیے وہ اُٹھی اور ڈائری سامنے رکھ کے باری باری مختلف لوگوں کے نمبر ملانے لگی ____ اور ہر جگہ توقع کے مطابق مایوس کن جواب پایا۔ آخری بار اس نے واجد خورشید کو نمبر ڈائیل کیے۔

اُس کی آواز سنتے ہی وہ بولا:

"بھابھی خیریت تو ہے۔ میں کتنی دیر سے آپ کا نمبر ملانے کی کوشش کر رہا ہوں ____ لیکن ہر بار آپ کا نمبر انگیج ملتا تھا ____ اور ایک خوشخبری سن لیں بھابھی ____" وہ جلدی سے بولا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے ایک فون موصول ہوا تھا ____ کوئی صاحب اسلم کا پتا دینا چاہتے تھے۔ میں نے آپ کا ایڈریس انہیں تفصیل سے سمجھا دیا ہے ____ ہو سکتا ہے وہ آتے ہی ہوں۔"

سارہ کا چہرہ مسرت سے چمک اُٹھا۔ "اگر آپ بھی آ جائیں واجد بھائی

تو بہتر ہے ــــ" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا تو میں آ رہا ہوں ــــ" واجد نے کہا اور سارہ نے رسیور کریڈل پر رکھ دیا اور بیگم ملک کی طرف گھوم کے بولی:

"لیجیے امّی، آپ کے بیٹے کی اطلاع مل گئی ــــ"

"کہاں سے ملی؟" وہ اُٹھ کے بیٹھ گئیں۔ "کس نے دی، کب آئے گا میرا اسلی؟"

"آپ کی آج کی بے قراری درست ہی تھی امّی"۔ سارہ نے ہلکے سے سانس بھر کے کہا۔ "واجد بھائی نے بتایا ہے، کوئی صاحب اُن کا پتا دینے آ رہے ہیں ــــ"

"او، پروردگار تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے، میرے مولا کریم"۔ بیگم ملک نے ہاتھ اٹھا کے کہا "تو ہی سب پر کرم فرماتا ہے"۔

اسی لمحے بیل کی مدھر آواز بنگلے میں پھیل گئی۔

"دیکھو بیٹا کون ہے ــــ جلدی جاؤ"۔ بیگم ملک نے بے تابی سے کہا۔

"فضل دین گیٹ پر جاؤ ــــ" سارہ نے ملازم سے کہا اور کھڑکی میں آ گئی۔

تب ہی اس نے دیکھا ــــ گیٹ کھلا تھا اور سیاہ بریف کیس ہاتھ میں لیے سیاہ سوٹ میں ملبوس ڈاکٹر اسلم حمید اندر داخل ہو رہا تھا ــــ چاروں پانچوں ملازم دانت پھاڑے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اُس کے

قریب جمع ہو گئے تھے۔

"کیا وہ پچھتا رہا تھا ــــ" سارہ زیرِ لب بڑبڑائی۔ "یا ممتا کی کشش کھینچ لائی ہے اُسے"

"امی کہاں ہیں؟" اُس نے سُنا وہ پوچھ رہا تھا۔

"اپنے کمرے میں ہیں، مالک ــــ" فضل دین نے آگے بڑھ کے کہا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ کمرے کی طرف آنے لگا۔

"چھوٹے مالک آگیا بیگم صاحب" ملازمہ لڑکی نوری اُن سے پہلے ہی کمرے میں داخل ہو کے چلّائی۔

اور بیگم ملک دل پر ہاتھ رکھ کے سیدھی ہو بیٹھیں۔ اُن کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا ــــ وہ اندر داخل ہوا اور تیزی سے آگے بڑھ کے ماں کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

"امی، میں آگیا ہوں ــــ پیاری امی اب میں آپ کو چھوڑ کے کہیں نہیں جاؤں گا ــــ مجھے معاف کر دیجیے امی ــــ ہمیں آپ کی زندگی کی ضرورت ہے ــــ آپ کے سائے کی ضرورت ہے۔ آپ ــــ اس قدر پریشان کیوں ہو گئی تھیں امی ــــ" وہ پیار سے بولا "کیا بیٹے ماؤں سے روٹھ نہیں جاتے"

"ہاں میرے بچے" بیگم ملک اُسے سینے سے بھینچے ہوئے بولیں۔ "مجھے امید تھی ــــ ایک دن میرا رُوٹھا ہوا بیٹا ضرور مان جائے گا۔ لیکن بیٹا" انہوں نے ہولے سے کہا۔ "عورت کا سہاگ اُس سے رُوٹھ

جائے تو وہ زندہ درگور ہو جاتی ہے ۔۔۔ تیری بیوی نے اس پورے ماہ میری خدمت ایک ماں جائی کی طرح کی ہے ۔۔۔ وہ عظیم عورت ہے بٹیا ۔۔۔ اگر وہ بُری ہوتی تو آج کو یہ گھر چھوڑ کے جا چکی ہوتی ۔۔۔ اپنی ماں کا کہنا مان لے چندا ۔۔۔ اور اس کی طرف لوٹ جا ۔۔۔ اپنی سہاگن کا ٹوٹا ہوا دل جوڑ دے بٹیا ۔"

"وہ کہاں ہے ؟" اسلم نے ہولے سے پوچھا۔

"چھوٹی بیگم آؤ ۔" نوری نے مسرت سے کہا ۔" صاحب تم کو پوچھتا ہے ۔"

اور سارہ ویسے ہی کھڑکی کا پردہ تھامے کھڑی رہی ۔ اسلم سیدھا ہوا ۔۔۔ وہ پلٹا تاکہ بدنصیب سہاگن کا دیدار کر سکے ۔۔۔ اور تب ہی اس کی نظریں کپکپا گئیں ۔ اس نے ایک دو بار پلکیں جھپک کے دیکھا ۔ وہ شہنا ہی تھی ۔۔۔ اس کی اپنی شہنی ۔۔۔ تب اس کے چہرے پر گہرا کرب چھا گیا ۔۔۔ سارہ نے اداس نگاہوں سے اُسے دیکھا اور پلکیں جھکا لیں ۔ ہلکے پیازی لباس میں سوگوار سی ۔۔۔ اُجڑی اُجڑی سی ۔۔۔ سہاگن اس کے ساکت دل کو لرزا گئی ۔۔۔ وہ کس قدر کمزور ہو گئی تھی ۔ موٹی موٹی غلافی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور بھرے بھرے پیازی ہونٹ ۔۔۔ ایک دوسرے میں پیوست ہوئے کس قدر زرد لگ رہے تھے ۔۔۔ اس کا جی چاہا بے اختیار اُسے بازوؤں میں بھینچ کے سسک اٹھے ۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا ۔۔۔ آہستہ قدموں سے آگے بڑھ آیا ۔

"شہنو —" اس نے دھیمے سے کہا۔

اور سارہ نے لرز کے آنکھیں موند لیں —

"مجھے معاف کر دو شہنا —" اس کا لہجہ شرمسار تھا۔

سارہ نے کوئی جواب نہیں دیا — خاموش کھڑی رہی۔

"سارہ بیٹیا" بیگم ملک نے کہا۔ "اسلم کو اس کے کمرے میں لے جاؤ۔ کچھ دیر آرام کر لے تو بہتر ہے۔"

"نہیں امی" وہ یک لخت اُن کی طرف پلٹ گیا۔ "آرام ہوتا رہے گا آج میں آپ کے پاس بیٹھوں گا — اور آپ کے ساتھ باتیں کروں گا۔" وہ مسکراتے ہوئے ان کی طرف بڑھ آیا۔

"آؤ سارہ تم بھی یہاں آ جاؤ — امی کے پاس" وہ سارہ سے مخاطب ہوا — اور وہ آہستہ قدموں سے آگے بڑھ کے بیڈ کے ایک کونے پر ٹک گئی — تب ہی گیٹ پر کسی گاڑی کے رُکنے کی آواز آئی — اور کچھ دیر بعد ہی ڈاکٹر واجد خورشید اور اس کی بیوی شاہانہ تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ ایک لمحے کو صورت حال دیکھ کے وہ ٹھٹک سے گئے — پھر واجد نے آگے بڑھ کے اُسے لپٹا لیا۔

"آپ تو بڑے سنگدل نکلے اسلم بھائی" شاہانہ نے منہ بنا کے کہا۔

"نہیں بھئی" واجد جلدی سے بولا۔ "صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔"

"اوہ تو اسلم بھائی کے لیے ایک ماہ کا دن ہوا کرتا ہے" شاہانہ

مسکرا کے بولی اور سب ہنس پڑے۔

"جاؤ بٹیا۔ ڈرائنگ روم میں آرام سے بیٹھو چل کے ـــ" بیگم ملک نے شفقت سے کہا۔

دونوں میاں بیوی نے انہیں سلام کیا۔ پھر واجد نے مسکرا کے کہا:

"آنٹی تو بالکل صحت یاب ہو گئیں ماشاء اللہ۔"

"اللہ میرے بچے کو سلامت رکھے۔" وہ پیار سے بولیں۔

پھر وہ سب لوگ بیگم ملک کے کمرے سے نکل کے ڈرائنگ روم کی طرف آ گئے۔

"لٹ لٹا کے آتے ہو خوب اچھی طرح۔" واجد نے مسکرا کے کہا۔

"کیا مطلب؟" اسلم نے چونک کے کہا۔

"گاڑی کہاں ہے تمہاری؟" واجد نے لب بھینچ کے کہا۔

تب اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا: "چھوڑو واجد ـــ ماضی کی کوئی بات مجھے یاد نہ دلاؤ تو بہتر ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا اور واجد ایک گہرا سانس بھر کے خاموش ہو گیا ـــ اور پھر واقعی اُس نے اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیں۔

"چائے یہیں منگوالوں یا آپ سب امّی کے کمرے میں پئیں گے؟" شہنا نے پوچھا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں امّی کے ساتھ پئیں گے ـــ" واجد اور شاہانہ بھی اُن کے ساتھ ہی اُٹھ گئے۔

بیگم ملک بہت خوش تھیں ۔ کچھ ہی دیر میں ان کی رنگت میں سُرخی جھلک آئی تھی ۔ چائے کے بعد انہوں نے شاہانہ سے کہا ۔

"جاؤ بیٹیا' سارہ کو دُلہن بنا دو ___ آج اس کا روٹھا دُلہا آیا ہے نا ___" سارہ نے سر جھکا لیا ۔

شاہانہ اور واجد نے شرارت سے اسلم کی طرف دیکھا ۔ اس کے لب سختی سے بھنچے ہوئے تھے ۔ یوں جیسے اپنے دل کا کرب چھپانا چاہتا ہو ۔

" اسلم بھائی ذرا دیکھیے تو ___" شاہانہ ہنس کے بولی ۔"بھابھی تو یوں شرما رہی ہیں جیسے بن بیاہی لڑکیوں کے سامنے بیاہ کی بات چھیڑ دیں ۔"

"ہاں تو میری بچّی کا بیاہ کب ہوا ہے ۔" بیگم ملک نے پیار سے کہا ۔ " نالائق ایک دن کی بیاہی چھوڑ کے تو چلا گیا تھا ___ آج آئے گا برات لے کے تو رخصت کروں گی اپنی بیٹی کو ___"

" بس ہمیں براتی سمجھ لیجیے آنٹی ___" شاہانہ ہنس کے بولی ۔

اسلم نے سارہ کی جانب دیکھا ۔ اس کی نگاہوں میں کتنی ہی حسرتیں تھیں ۔ ایک سرد سانس بھر کے اس نے کھڑکی سے باہر نگاہ جما دی ۔

"کیوں اسلم بھائی کیا یاد آیا ؟" شاہانہ جھک کے آہستہ سے بولی ۔

ایک پھیکی سی مسکراہٹ اسلم کے چہرے پر اتر آئی ۔

"مجھے اعتراف ہے بھابھی ___" اس نے دھیمے سے کہا ۔"میں نے سارہ کو بہت دکھ دیے ہیں ___ خدا مجھے معاف کرے ۔"

"یہی بہت ہے، آپ کو اپنی غلطی کا احساس تو ہوا —" شاہانہ نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر سارہ کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

"آئیے بھابھی، آپ کو دلہن بنا دوں"

سارہ خاموشی سے اٹھ گئی۔

اور دونوں آگے پیچھے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں — تب واجد نے کہا۔ "جب سے آئے ہو ایسے ہی بیٹھے ہو — جاؤ غسل وغیرہ کر کے کچھ دیر آرام کرو۔ میں آنٹی سے باتیں کروں گا"

اسلم نے سر ہلایا اور خاموشی سے اُٹھ کے باہر چلا گیا۔

۲۳

ایک دل تھا وہ بھی تجھ کو دے دیا،

اب میں امیدوں کو دفناؤں کہاں

اور تنہائی محسوس کرتے ہی اس نے ڈاکٹر اسلم حمید کا تصوّر چھوڑ دیا —— اب وہ خالد تھا —— حرماں نصیب خالد —— جسے تقدیر پلٹے کھا کھا کے چوٹ دے رہی تھی —— اس نے اپنا تصوّر پایا اور کھو دیا —— جدائی کا زخم دل پر لے کے وہ جینے کی کوشش کر رہا تھا کہ تقدیر اُسے اس مقام پر لے آئی اور کس قدر بے دردی سے ہنس رہی تھی وہ اپنے اس مذاق پر' یہ قدرت کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا تھا کہ وہ اپنی ہی محبوبہ کے قریب چلا آیا تھا دور رہنے کے لیے جو اُس کی اپنی ہوتے ہوتے بھی اپنی نہ تھی۔

وہ قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا تھا —— چند لمحے اپنے عکس میں خالد وصی کی حرماں نصیب ہستی کو دیکھتا رہا —— اور پھر اس ہستی کو خدا حافظ کہہ کے ڈاکٹر اسلم حمید اپنے کمرے سے باہر آ گیا —— کچھ دیر پہلے شاہانہ اُسے اطلاع دے گئی تھی کہ حجلۂ عروسی میں اُس کی دُلہن اُس کا انتظار کر رہی ہے —— وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا —— سارہ کے کمرے کے دروازے پر آ رُکا —— پھر پردہ اُٹھا کے اندر داخل ہو گیا۔

وہ گہرے سُرخ لباس میں سمٹی ہوئی سامنے پھولوں کی سیج پر موجود تھی —— وہ چند لمحے دُلہن کے اس حسین پیکر کے قریب ساکت کھڑا

رہا ـــــ پھر آگے بڑھ کے ایک فاصلہ قائم رکھتے ہوئے سیج پر بیٹھ گیا ـــــ ہاتھ بڑھا کے گھونگھٹ اٹھایا ـــــ شہنا کے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے اس حسن کو اُس کی نگاہ نے پہلی بار محسوس کیا تھا ـــــ چند لمحے وہ مبہوت رہا ـــــ پھر اُس کے لبوں نے حرکت کی۔

دُکھ سے بولا: "شہنو ـــــ اس رُوپ میں تمہیں دیکھنے کی تمنا تھی ـــــ اُمید نہیں تھی کہ یہ محروم تمنا بر آئے گی ـــــ یقین نہیں آتا کہ میری شہنا میری دُلہن میرے سامنے موجود ہے ـــــ" اس کی آواز جذبات سے بوجھل ہو کے بھر آئی تھی ـــــ سارہ نے تڑپ کے آنکھیں کھول دیں ـــــ "آہ، یہ کس کی آواز تھی" اس کے دل نے سسکی بھری۔ بے اختیار جی چاہا، خالد کہہ کے سامنے والے شخص کے سینے سے لگ جائے ـــــ لیکن ـــــ وہ ساکت رہی، نگاہوں میں ویرانی سمٹ آئی ـــــ خالی خالی نظروں سے اپنے دُلہا کو دیکھتی رہی ـــــ اُس نے اپنے دل سے کہا:

"مجھے اپنے جذبات پر قابو پانا ہے۔ نادان، اپنے شوہر کی خوشنودی کا خیال رکھنا ہے"

"کیا تم نے مجھے معاف کر دیا سارہ" ڈاکٹر اسلم کی آواز اُبھری۔

تب وہ آہستہ سے بول اُٹھی ـــــ "میرے سرتاج، میں آپ کی گناہ گار ہوں ـــــ مجھے معاف کر دیں" وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہ گیا۔

"میں آپ کی ہوں سرتاج صرف آپ کی، مجھے معاف کر دیں" اُس کا

لہجہ لرز گیا ــــ پھر وہ اس کے قدموں میں جھک گئی تھی ــــ لیکن اس نے یوں اسے بازوؤں میں تھام لیا جیسے وہ شیشے کی ہو ــــ

"شہنی" اس کی آواز جذبات سے بوجھل ہو گئی، پھر بے اختیار اُس نے سارہ کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا تھا ــــ مگر اگلے ہی لمحے بڑی احتیاط کے ساتھ اس نے اُسے علیحدہ کر دیا ــــ

"شہنو، میری جان، خدا حافظ ــــ" اس نے لرزتی آواز میں کہا اور آہستگی سے اُٹھ گیا ــــ سارہ نے ایک جھٹکے سے سر اُٹھا کے اُسے دیکھا پھر غم انگیز لہجے میں بولی:

"آپ پھر مجھ سے روٹھ کے جا رہے ہیں اسلم"

"نہیں، سارہ بخدا میں تم سے نہیں روٹھ سکتا ــــ میں ــــ میں" اس کی آواز بھرّا گئی۔

ایک لمحے کے لیے وہ سارہ کے خوبصورت چہرے کو دیکھتا رہا، پھر کرب سے لب کاٹ کے آنکھیں بند کر لیں۔

"سارہ، تم کسی کی امانت ہو ــــ تم ــــ کسی کی امانت ہو سارہ"

"امانت" سارہ نے ایک گہرا سانس بھر کے اسلم کی طرف دیکھا اور خاموشی سے سر جھکا لیا۔

وہ پلٹا ــــ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

زندگی ــــ گزرتی رہی ــــ بیگم ملک مطمئن تھیں کہ اسلم نے کلب

جانا اب قطعی چھوڑ دیا تھا۔ مگر وہ بہت اُداس رہتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں ۔۔۔ سارہ اب بھی شوہر کو اپنا نہیں بنا سکی ۔۔۔ وہ محض دکھاوے کی خاطر سارہ سے ملتا تھا۔ اس کے ساتھ ہنستا تھا، بولتا تھا ۔۔۔ مگر یہ بیگم ملک ہی جانتی تھیں کہ وہ اس سے کس قدر الگ ہے۔ اکثر کبھی بیگم ملک کے اصرار پر اور کبھی ڈاکٹر واجد اور شاہانہ کی ضد سے وہ دونوں باہر جاتے تھے ۔۔۔ ورنہ زیادہ تر وہ گھر ہی میں رہتا تھا اور سارہ حیران تھی ۔۔۔ کہ اسلم جیسا باغیرت شخص جو اپنی بیوی کی زبان سے ایک اجنبی نام سُن کے بپھر اٹھا تھا اب کس قدر خاموش تھا اور خالد کا منتظر تھا۔

"کیا واقعی میرا خالد ہی میری طرف لوٹ آئے گا" وہ دیوانوں کی طرح سوچتی ۔۔۔ اور پھر اپنی اس سوچ پر خود ہی ہنس پڑتی۔ اُس نے بارہا اس شخص میں اپنے محبوب کی پرچھائیاں محسوس کیں ۔۔۔ جب سلگتی ہوئی سگریٹ انگلیوں میں تھام کے وہ سوچ کی وادیوں میں گم ہو جاتا ۔۔۔ اپنے مخصوص انداز میں آہستہ آہستہ کھانا کھاتا ۔۔۔ اپنی مخصوص سحر انگیز چال کے ساتھ اُس کے سامنے آتا تو ماضی کی دلفریب یادیں اُس کی نگاہوں میں سرور سا بھر دیتیں۔ وہ بغیر پلک جھپکائے اُسے دیکھتی رہ جاتی ۔۔۔ لیکن جیسے ہی اس کی نگاہ جنبش کرتی وہ سہم کے نظریں جھکا لیتی۔ مبادا وہ اس کی آنکھوں میں کسی کا خیال پالے اور پھر روٹھ جائے ۔۔۔ وہ بہت اُداس رہتا تھا۔ سارہ اس کی دلجوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی مگر وہ اس سے کھچا کھچا تھا ۔۔۔ لیکن بعض اوقات وہ جذبات میں ڈوب کے نہ جانے کیا اول فول بکنے لگتا

اور جو سارہ کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس دن بھی اس کی حالت درست نہیں تھی۔ سارہ بیگم ملک کو دوا دے کے باہر نکلی تو وہ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور سیاہ آنکھوں میں گلابی ڈورے تھے۔ لب دبائے وہ غور سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے اسلم؟" اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"سارہ، تم نے مجھے بڑا غم دیا ہے —— سارہ تم نے مجھے توڑ کے رکھ دیا ہے۔" وہ دونوں ہاتھوں سے سینے کو دبائے ہوئے بہت کرب سے کہہ رہا تھا۔

"میں پشیمان ہوں اسلم —— آپ بھول کیوں نہیں جاتے —— میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔" وہ اس کے قریب رُک کے سر جھکاتے ہوئے بولی۔

"تمہاری یہی معافی مجھے تکلیف دیتی ہے شہنو۔" وہ سر جھٹک کے بولا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ اُلجھنے لگی۔

"آیئے باہر سیر کے لیے چلتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "جایئے آپ لباس تبدیل کیجیے۔" اور وہ ایک دم مسکرا دیا —— آہستہ سے بولا۔ "سوری ڈارلنگ —— تمہارا محبوب بعض اوقات دیوانہ ہو جاتا ہے۔" سارہ ہنس دی۔ "اسی لیے میں نے کہا ہے کہ باہر کی ہوا سے شاید دماغ ٹھکانے آ جائے۔" وہ مسکرایا پھر لباس تبدیل کرنے کے لیے کمرے کے اندر پلٹ گیا —— وہ برآمدے میں ٹہل کے اس کا انتظار کرنے لگی۔

اُس نے بھورے رنگ کا بیل باٹم اور سفید کشمیری کام کی شال اوڑھی ہوئی تھی ـــــ اور کچھ دیر بعد اسلم بھی تیار ہو کے باہر نکل آیا۔ سارہ نے ایک ستائشی نگاہ اس کی جانب ڈالی اور ایک دبا دبا سانس اس کے لبوں سے نکل گیا ـــــ سفید بند گلے کی جرسی اور چاکلیٹی خوبصورت تراش کی پینیٹ میں وہ بہت وجیہہ لگ رہا تھا ـــــ لیکن یہ بات سارہ نے محسوس کی کہ وہ پہلے والے اسلم سے کسی قدر تبدیل ہو چکا تھا۔ اب اس کی صحت قدرے گر گئی تھی۔ وہ لغور اُسے دیکھتی رہی اور اسلم آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اُس کے قریب آگیا ـــــ پھر وہ دونوں برابر چلتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھ گئے جہاں تھوڑا عرصہ پہلے خریدی گئی ہلکی نیلی بیوک کھڑی تھی۔۔ بیگم ملک کھڑکی سے انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

تب ہی اچانک گہرے براؤن رنگ کی اوپل کار، گیٹ پر کھڑی ہوئی بیوک کے قریب آ رُکی ـــــ اور پٹ کھول کے نیوی بلیو سوٹ میں ملبوس ایک وجیہہ نوجوان نیچے اتر آیا ـــــ بیگم ملک غور سے اُسے دیکھنے لگیں ـــــ پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں ـــــ وہ گیٹ کی طرف بڑھا پھر ٹھٹک کے رُک گیا ـــــ اور اس کے ساتھ ہی وہ دونوں بھی ـــــ سارہ نے آنے والے کو آنکھیں پھیلا کے دیکھا جس کے لب طنزیہ مسکراہٹ سے پھیل گئے تھے۔

آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ آگے بڑھ آیا۔

"تو ـــــ تم یہاں پہنچ ہی گئے خالد وصی"۔ اُس نے لفظ چبا کے کہا۔

"خالد ــــ" سارہ نے تڑپ کے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے شخص کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک کربناک مسکراہٹ تھی۔

اُس نے ہولے سے کہا: "آپ نے مجھے ٹھیک پہچانا ڈاکٹر اسلم ــــ میں خالد وصی ہوں"

"میری غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کے تم نے خوب بہروپ بھرا ــــ محبوبہ کو حاصل کرنے کا بڑا آسان طریقہ ہے۔" اس کا لہجہ زہر میں بُجھا ہوا تھا۔ پھر آگے بڑھ کے اُس نے پوری قوت سے اپنا مضبوط ہاتھ خالد کے منہ پر دے مارا ــــ

تب ہی بیگم ملک کی چیخ بنگلے میں گونج گئی:

"اسلم رُک جاؤ ــــ" وہ دوڑتی ہوئی اُس جانب آ رہی تھیں۔

خالد نے ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں کہا: "ڈاکٹر اسلم آپ مجھے غلط سمجھے"

"بکواس بند کرو ــــ" وہ حلق کے بل چیخا اور پھر بیگم ملک کی پروا کیے بغیر یکے بعد دیگرے کئی مکّے اس کے منہ پر دے مارے ــــ وہ لڑکھڑا کے دیوار سے جا ٹکا۔

تب ہی انہوں نے دیکھا ــــ خالد کے لبوں سے تیز چمکیلے خون کی ایک موٹی لکیر، بہہ کے اُس کی خوبصورت ٹھوڑی سے نیچے جا رہی تھی۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے ڈاکٹر اسلم کی طرف دیکھ رہا تھا جس کا جسم اب بھی غصّے کی شدّت سے کانپ رہا تھا۔

"اسلم، خدا کے لیے بیٹا" بیگم ملک دوڑتے قدموں سے اُن کی

طرف بڑھ رہی تھیں۔

"اس نے میری غیرت کو جھنجوڑا ہے امّی ۔" وہ تڑپ کے پھر خالد کی طرف بڑھا۔ "میں ___ میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔"

اُسی لمحے بیگم ملک نے تیزی سے آگے بڑھ کے اُسے دھکیل دیا۔

"میں آپ کو بھی معاف نہیں کروں گا امّی ۔" وہ کانپتے ہوئے بولا۔ "آپ نے میری عزت کے ڈاکو کو اس گھر میں پناہ دی ہے ___" اس نے خالد کو گریبان سے پکڑ کے بے دردی سے جھنجوڑ ڈالا۔

"وہ عظیم ہے ___" بیگم ملک نے بیٹے کو اپنی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔ "وہ عظیم ہے اسلم ___" ان کی آواز بھرّا گئی۔ "وہ تیری ماں کی زندگی کے لیے آیا تھا صرف تیری ماں کی زندگی کے لیے۔" اسلم نے پلٹ کے ماں کی طرف دیکھا اور وہیں رُک گیا۔

بیگم ملک آگے بڑھیں اور اپنے سفید آنچل کیساتھ خالد کے ہونٹوں سے بہتا ہوا لہو صاف کرنے لگیں ___

"امّی ، خالد نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا۔" میں آپ کا گناہ گار ہوں امّی ___ میں نے آپ کو دھوکا دیا ہے ___ مگر ___ مگر صرف آپ کی زندگی کے لیے ___" وہ آنکھیں موند کے زور زور سے سانس لینے لگا ___ "لیکن خدائے بزرگ و برتر کی قسم امّی ___ میں نے سارہ کو کبھی دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی ___ میں نے ہمیشہ اُسے آپ کے بیٹے کی امانت سمجھا ہے۔"

"میرے بچے، میرے چاند ــــ" انہوں نے بازو پھیلا دیے اور خالد اُن کے سینے سے آلگا۔

"میرے بچے، تو بھی تو میرے بیٹے جیسا ہے۔" انہوں نے اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

کتنے لمحے ایسے ہی بیت گئے ــــ پھر انہوں نے ایک زور کی چیخ ماری تھی اور خالد کو الگ کر کے وہ دیوانہ وار اُس کے سر کے پچھلے بالوں کو ٹٹول رہی تھیں۔

اور پھر خالد کی سپید گردن پر ایک سیاہ مخملی داغ نمایاں طور سے نظر آنے لگا۔ ان کے لب کپکپا رہے تھے اور وہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ خالد کے لبوں سے بہتا ہوا سرخ لہو اُس کی سفید اُونی جرسی میں جذب ہو رہا تھا اور اُس کی سیاہ گھنیری پلکوں والے بھاری پپوٹے دھیمے دھیمے لرز رہے تھے۔

بیگم ملک نے ہولے سے کہا:

"تمہاری ماں کا نام مہر نگار ہے ــــ تم اسمٰعیل وصی کے بیٹے ہو؟"

اور خالد نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا ــــ تب بیگم ملک نے ایک بار پھر اُسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا:

"میرا بچہ، میرا لال تو میرا ہی تو لختِ جگر ہے۔" پھر وہ اسلم کی طرف پلٹیں اور زور سے بولیں:

"خالد ــــ تیرا بھائی ہے ــــ تیرا خون ــــ"

"میرا بھائی، میرا خون ـــــ" اسلم بڑبڑایا۔ پھر ماں کے خون آلود دوپٹے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: "کیا یہ میں نے بہایا ہے ـــــ امّی ـــــ اپنے ـــــ اپنے بھائی کا خون ـــــ"

اُس نے خالد کی طرف دیکھا ـــــ اس کے لب کپکپا رہے تھے اور آنکھوں میں عجیب سے جذبات تھے ـــــ پھر آگے بڑھ کے اس نے خالد کو اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

خالد کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"سارہ، واجد کو فون کرو ـــــ ایمبولینس کے لیے بھی کہہ دینا۔"
اسلم نے تیز لہجے میں کہا۔

سارہ جو ساکت کھڑی تھی ـــــ ایک جھرجھری لے کے رہ گئی ـــــ پھر وہ دوڑتی ہوئی ـــــ اندر کی جانب چلی گئی۔

واجد کو اطلاع دیتے دیتے وہ فون پر ہی پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ کچھ دیر بعد ہی ایمبولینس گیٹ پر آ رُکی اور واجد دوڑ کے اندر آ گیا ـــــ اور اس کے ساتھ ہی سٹریچر اٹھاتے ہوئے دو وارڈ بوائز۔

یہاں خالد اور اسلم کو دیکھ کے وہ چکرا گیا ـــــ لیکن وہ وقت نازک تھا۔ استفسار مناسب نہ سمجھتے ہوئے اس نے خالد کو سہارا دے کے سٹریچر پر لٹا دیا اور اسلم کے ساتھ ایمبولینس کی طرف بڑھ گیا ـــــ اسلم راستے میں اُسے کچھ بتاتے ہوئے چل رہا تھا ـــــ اُن کے جانے کے بعد سارہ اور بیگم ملک، اسلم کی گاڑی میں ہسپتال جا پہنچیں۔

وہاں ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد بتایا کہ خالد کو ٹی بی کا آخری مرحلہ ہے اور اب کوئی کوشش کارگر ثابت نہیں ہو سکتی ـــــ اس کے باوجود ڈاکٹر اپنی سی کوشش کر رہے تھے ـــــ اُسے آکسیجن دی جا رہی تھی۔ اور خون چڑھایا جا رہا تھا۔

اور وہیں بیگم ملک نے اسلم اور سارہ کو بتایا کہ خالد اور اسلم جڑواں بھائی ہیں ـــــ

۲۴

غم کے اُفق میں ہو گئے سورج کئی غروب
آلام کے گہن میں کئی چاند گہہ گئے

آج سے چھبیس برس پہلے ـــــ" بیگم ملک نے کہا: "جس میٹرنٹی ہوم میں ـــــ میں داخل تھی ـــــ وہیں میرے روم میں میرے برابر والے بیڈ پر مہر نگار نام کی ایک اور لڑکی بھی تھی ـــــ دُبلی پتلی جذباتی سی ـــــ گھنٹوں میرے ساتھ باتیں کیا کرتی ـــــ اس نے بارہا اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اس بار خدا اُسے بیٹا دے۔ اُس کے شوہر کو بیٹے کی آرزو تھی ـــــ اور اُس کی سب سے بڑی تمنا اپنے شوہر کی خوشنودی تھی۔

پھر اُس کے ہاں پیدائش کا وقت قریب ہوا ـــــ میں مضطرب تھی ـــــ اور یہ جان کے واقعی مجھے گہرا صدمہ پہنچا کہ اس نے ایک لڑکی کو جنم دیا ہے ـــــ لڑکی آپریشن کے ذریعے ہوئی تھی اور بہت کمزور تھی ـــــ اس کے گھر سے کوئی بھی نہیں پہنچا تھا اور مہر نگار بے ہوش تھی ـــــ اور پھر ہوش میں آنے سے پہلے ہی وہ مامتا سے محروم ہو گئی تھی ـــــ لڑکی چند گھنٹے زندہ رہ کے باوجود ڈاکٹروں کی کوشش کے مر گئی تھی ـــــ اور اسی دوران میں مجھے بھی دو جڑواں لڑکے پیدا ہوئے۔

اکرم ملک اُن دنوں لیبیا میں تھے۔ میرے پاس ملازمہ کے سوا اور کوئی نہ تھا ——— اور میں نے ڈاکٹروں کو اعتماد میں لے کے ایک بچّہ مہرنگار کے پہلو میں لٹا دیا ——— بچوں میں سرِمو کوئی فرق نہ تھا ——— مہرنگار نے آنے والے بیٹے کے لیے بہت سے ننھّے منّے کپڑے تیار کیے تھے ——— اور انہی میں سے کچھ کپڑے بچّے کو پہناتے ہوئے مَیں نے دیکھا تھا کہ اس کی گردن کے پچھلے حصّے پر ایک سیاہ مخملی داغ ہے۔

اس وقت میں نے سوچا تھا ——— نہ جانے زندگی کے کسی موڑ پر کبھی میرا یہ بچّہ میرے سامنے آئے تو میں اسے ضرور پہچان لوں گی۔ اور اب میں سمجھتی ہوں کہ خالد کے منہ سے بہتا ہوا خون دیکھ کے میری مامتا کیوں تڑپ گئی تھی۔

"اور یہ بھی محبّت کا ہی جوش تھا آنٹی" واجد نے ایک گہرا سانس بھر کے کہا ——— "کہ وہ آپ کی جان بچانے کی خاطر دوڑا چلا آیا"

اسی وقت خالد نے ہاتھ مار کے آکسیجن کی نلکی ناک سے الگ کر دی ——— وہ اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا ——— سب اُس کے بیڈ کے گرد جمع ہو گئے ——— اس کی سیاہ آنکھوں نے اسلم کو اشارہ کیا۔ اور وہ اس کے اوپر جھک گیا۔

"شہنا ——— تم ——— میری محبّت تھی بھیّا ——— اس کا ———

خیال رکھنا ——" ٹوٹے ٹوٹے الفاظ اُس کی زبان سے ادا ہوئے۔

اسلم تڑپ گیا۔

"تم صحت یاب ہو جاؤ، پیارے بھائی —— میں سارہ سے الگ ہو جاؤں گا۔"

"نہیں —— نہیں ——" خالد زور سے بولا؛ "نن نہیں —— تم اس کا سہاگ ہو بھیا —— تم —— تم —— میری شہنا کا —— سہاگ ہو بھیا —— اس سے —— مت روٹھنا —— میں —— میں" وہ سوگواری سے ہنسا —— "میں تو —— خود ہی —— جا رہا ہوں —— خدا حافظ ——"

وہ بہت زور سے بولا —— اور سانس کی باریک ڈوری ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئی۔

سارہ کے منہ سے ایک تیز چیخ بلند ہوئی —— اور اسلم نے پلٹ کے اسے بازوؤں میں لے لیا —— وہ ایک لمحے کو تڑپی —— پھر اسلم کے سینے میں منہ چھپا کے سسک سسک کے رونے لگی۔

"وہ تیرا سہاگ قائم کر گیا بچی"! بیگم ملک نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اپنے خون سے تیرا سہاگ قائم کر گیا ——"

اور اپنے خون آلود آنچل سے شہنا کا سر ڈھکتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کے رو دیں۔

تاریخی ناول

الناصر : رئیس احمد جعفری ۔ ضخامت :- ۴۶۸ صفحات
اندلس کے قصر الزہرا کی ایک تاریخی داستان ۔ قیمت ۵۰/۱۲ روپے

ایک مہاجر : رئیس احمد جعفری ۔ ضخامت ۳۶۸ صفحات
گزشتہ انقلاب کی تاریخی روئیداد قیمت

بالاکوٹ : رئیس احمد جعفری ۔ ضخامت :- ۵۳۰ صفحات
ناول کے پیرائے میں ایک سچی اور مستند تاریخ ۔ قیمت -/۱۵ روپے

حق و باطل : رئیس احمد جعفری ۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات
عبداللہ بن زبیرؓ مجاہدانہ زندگی کی ولولہ انگیز اور لرزہ خیز داستان -/۵ روپے

خون بہتا رہا : رئیس احمد جعفری ۔ ضخامت ۵۰۸ صفحات
ادب و انشاء کی خوبیوں کا گراں بہا مجموعہ قیمت -/۱۵ روپے

گردِ کارواں : رئیس احمد جعفری ۔ ضخامت ۵۳۶ صفحات
صقلیہ (سسلی) کے مسلمانوں کے جاہ و جلال کی عبرتناک کہانی -/۱۵ روپے

بنی احمر کا خواب : عشرت رحمانی ۔ ضخامت ۲۸۰ صفحات
ابن سراج کی عشقیہ داستانوں اور جنگی کارناموں کی سرگزشت -/۶ روپے

سلطانہ : رئیس احمد جعفری ۔ ضخامت ۳۰۰ صفحات
روس کے ایک مسلمان قبیلہ کی لڑکی نشاط خانم کی خود نوشت سرگزشت -/۹ روپے